(نمرہ احمد)

قسط نمبر 21:

''کافر۔ ماکر۔ کاذب۔ قاتل'' (حصہ اول)

تمہیں جنگ میں کامیابی ملے گی
صرف مکاری سے!
سو تم خود کو رکھنا ہوا کی مانند تیز...
اور جنگل کی مانند گھنا...
جھپٹنا آگ کی لپٹ کی طرح...
اور جم کر کھڑے ہونا پہاڑ کی طرح...
اپنے منصوبوں کو پراسرار رکھنا رات کی طرح
اور جب چلو تو بجلی کی کڑک کی طرح گرنا
جب مضبوط ہو تو خود کو کمزور ظاہر کرنا
اور جب کمزور ہو تو خود کو مضبوط ظاہر کرنا۔
دشمن کو لڑے بغیر چت کر دینا
ہی بہترین فتح ہے!
فتح یاب جنگجو پہلے جنگ کو جیت لیتے ہیں
اور پھر اس جنگ کو شروع کرتے ہیں۔
شکست خوردہ لوگ پہلے جنگ شروع کرتے ہیں
اور پھر اسے جیتنے کی کوشش کرتے ہیں۔
ساری جنگی حکمت عملی مختصر ہے

فریب کاری پہ
تب حملہ کرو جب لگے کہ نہیں کر سکتے
جب قوت استعمال کر رہے ہو تو لگے کہ تم جامد بیٹھے ہو
جب قریب پہنچ چکو تو خود کو دور ظاہر کرو
اور جب دور ہو تم
تو یقین دلا دو اسے کہ تم ہو بہت قریب!
اگر اس کی طاقت تم سے کہیں زیادہ ہے
تو اس سے اعراض برتو
اگر وہ غصیلا ہے تو اس کو چھیڑو
خود کو کمزور ظاہر کرو تا کہ وہ غرور میں بڑھتا جائے
اگر اس کی فوجیں متحد ہیں تو ان کو توڑو۔
اس پہ تب حملہ کرو جب وہ تیار نہ ہو
اور وہاں سے کرو جہاں
تمہارے ہونے کا اسے گماں تک نہ ہو
صرف وہ جیتے گا جنگ'
جو جانتا ہے کہ کب ہے لڑنا!
اور کب ہے نہیں لڑنا۔

(The Art of War) Sun Tzu
(دی آرٹ آف وار)

چند ساعتوں کے لیے ہم ماہ کابل کی رات میں واپس جاتے ہیں۔

کرنل خاور کو بے ہوش کر کے اس کے پیسے اسلحہ اور پاسپورٹ چرا کر سعدی یوسف اب تیز تیز سڑک کنارے چلتا جا رہا تھا۔ بار بار احتیاط سے پیچھے مڑ کر دیکھتا۔ سوتے جاگتے شہر میں کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ ذرا دور جا کر اس نے ایک ٹک ٹک رکشہ روکا اور اس میں سوار ہو گیا۔ "بلرز لین۔" اس نے فوراً سے پتہ بتایا۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد وہ اسے پاکستانی سفارت خانے سے چند فرلانگ دور اتار گیا۔ وہ ٹک ٹک سے اترا' اور دور...کافی دور نظر آتی سفارت خانے کی عمارت کو دیکھا۔ سفید اونچے محل جیسی عمارت جس کے سامنے سرسبز لان بنا تھا۔ وہ اس اجنبی ملک میں پاکستان کی سرزمین کا واحد ٹکڑا تھی' جس پہ لنکن قانون نہیں چل سکتے تھے' وہ ایک دفعہ اس میں داخل ہو جائے تو لنکن پولیس اسے چھو بھی نہیں سکتی تھی۔

اسٹریٹ میں لوگ' ٹریفک' روشنیاں' سب جاگ رہے تھے۔ سعدی کی نگاہیں عمارت سے ہٹ کر سڑک پہ پھسلیں۔ کونے میں درخت کے ساتھ ایک سیاہ وین پارکڈ تھی۔ پرلے کونے میں ایک آدمی کھڑا موبائل پہ بات کر رہا تھا۔ وہ ہاشم کا آدمی تھا کیا؟ وہ سفارت خانے جائے گا' سب کو اندازہ تھا۔ اس کی تاک میں بیٹھے ہوں گے وہ لوگ۔ وہ ایک ایک چہرے کو دیکھتا۔ ہر شخص مشکوک تھا' ڈرا رہا تھا۔

اس سفارت خانے میں بھی لنکا ڈھانے کے بہت سے دیسی بھیدی ہوں گے ہی۔

سعدی واپس رکشے میں بیٹھا اور اسے چلنے کو کہا۔ بیگ سینے سے لگائے اب وہ سمٹ کر بیٹھا تھا' محتاط۔ قدرے ڈرا ہوا۔ اب وہ کیا کرے گا؟ کچھ علم نہیں تھا۔ خاور کو گرانا تو پلان کیا تھا' مگر اس سے آگے نہیں۔

ٹک ٹک نے اسے ایک ہوٹل کے کنارے اتارا۔ وہ چند منٹ ادھر کھڑا رہا۔ (کیا ان کو معلوم نہیں ہوگا کہ وہ کسی ہوٹل جائے گا؟) وہ مڑ گیا اور اسٹریٹ میں آگے چلتا گیا' چلتا گیا یہاں تک کہ ٹانگیں تھک گئیں اور تنفس تیز چڑھ گیا تو وہ رکا۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں سے سمندر کی لہروں کا شور سنائی دیتا تھا۔ سمندر...جو انسان کے دل جیسا ہوتا ہے' کبھی پرسکون' کبھی اضطراب سے ٹھاٹھیں مارتا...ہر پل بدلتا...

وہ مین روڈ سے اتر کر ساحل تک آ گیا۔ ساحل کا یہ حصہ سنسان پڑا تھا۔ اوپر پورا چاند خاموشی سے بادلوں کے بیچ نیم دراز' گویا ٹیک لگا کر بیٹھا' نیچے بہتے سمندر کو کھینچ رہا تھا۔ ٹھاٹھیں مارتا شور...چیختی چنگھاڑتیں' کئی کئی فٹ بلند ہوتیں لہریں' اور پھر واپس پسپا ہوتا پانی...

وہ ایک طرف آ گیا جہاں چٹانیں اور پتھر سے پڑے تھے۔ بیگ اتار کر نیچے رکھا' اور ٹیک لگا کر وہیں بیٹھ گیا۔ ٹھنڈ بھی تھی' اوپر سے پورا جسم نمی کا شکار ہونے لگا تھا۔ اس نے سر پتھر سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ اور نیند تو سولی پہ بھی آ ہی جاتی ہے' وہ سولی سے گزر کر آیا تھا' سو دھیرے دھیرے اس کا جسم ڈھیلا پڑتا گیا۔ ذہن نیند میں ڈوبتا گیا۔

اس کی آنکھ جانے کس آواز سے کھلی تھی۔ ایک دم وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ بیگ کو دیکھا۔ سب ٹھیک تھا۔ مگر...اس نے چہرہ اٹھایا...ایک چیز غلط تھی۔

سورج نکل آیا تھا۔

سامنے افق پہ سنہری تھال اتنا چمکیلا' آگ برسا رہا تھا' کہ سعدی کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے فوراً چہرہ ہاتھوں میں گرا لیا۔ صبح روشن تھی اور ٹریفک پیچھے سڑک پہ رواں دواں تھی۔ رش' لوگ' آوازیں۔ اس نے ہر چیز کے لئے خود کو تیار کیا تھا۔ سوائے ایک کے۔

سورج! جو اس نے آٹھ ماہ سے نہیں دیکھا تھا۔ 21 مئی سے 21 جنوری...پورے آٹھ ماہ۔

سعدی بدحواسی سے اٹھا' بیگ اٹھایا اور سڑک کی طرف بھاگا۔ سورج اس کی پشت پہ آگ برسا رہا تھا' گویا پیچھا کر رہا ہو اور وہ خوفزدہ سا

آگے بھاگتا جا رہا تھا۔ ہاتھ پیر عجیب سی سنسنی کا شکار تھے۔ سردی میں بھی پسینے آ رہے تھے۔ وہ رکا نہیں۔ ہر طرف روشنی تھی۔ تیز روشنی۔ یوں جیسے ساری دنیا کے پردے ہٹ گئے ہوں گے۔ عیاں ہو گیا ہو سب۔ وہ دوڑتا گیا۔ سڑک کنارے...گلیوں میں...وہ تیز تیز بھاگتا گیا۔

اس سارے میں ایک بھی جگہ نہیں نظر آئی جہاں وہ رک سکے۔ جہاں وہ رکنے کا سوچے ہی۔ چوکنی مگر خوفزدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھ کر چلتا وہ ایک جگہ بالآخر رک گیا۔

یہ ایک پرانا کارخانہ تھا جو بند پڑا تھا۔ اس کھنڈر کو نشئی لوگ اپنے قیام کے لئے استعمال کرتے تھے۔ وہ بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا اور آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک بالکل اندرونی کمرے میں آ رکا...جہاں سورج کی روشنی نہ پہنچتی تھی۔ گندا' میلا' کاٹھ کباڑ سے بھرا کمرہ...کچھ بھی برا نہیں لگا اسے۔ بس ہانپتا ہوا وہ جلدی سے نیچے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ بالکل سکڑ سمٹ کر' خوفزدہ نگاہیں دروازے پہ جمائے۔۔ خاور کی پستول ہاتھ میں رکھ لی۔ کوئی آئے اور وہ اسے چلا دے۔

سعدی اگلے کئی گھنٹے اسی طرح بیٹھا رہا۔ جسم اکڑ گیا۔ پستول اب بھی ہاتھ میں تھی۔ چہرے پہ پسینہ تھا۔ ہر آہٹ پہ وہ چونک کر سیدھا ہوتا۔ پستول تان لیتا۔ مگر وہ ہوا کا کوئی کھٹکا ہوتا' یا نیچے بیٹھے نشئیوں کی آوازیں۔ کولمبو بالکل کراچی جیسا تھا۔ وہی ماحول' وہی آدھے صاف ستھرے پوش علاقے اور باقی اس کے برعکس۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اپنی تعمیر اٹھاتے تو کوئی بات بھی تھی
تم نے اِک عمر گنوا دی میری مسماری میں

سبز بیلوں سے ڈھکے بنگلے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر ادھا رنج کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ فارس نے کار سے نکلتے ہوئے سیل فون کو کان سے لگایا اور آستین کا خون آلود حصہ اندر کو موڑ لیا۔ آنکھیں چندھیا کر دور سنہرے آسمان پہ جمائے' وہ گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا دوسری طرف جاتی گھنٹی سن رہا تھا۔

''ہاں فارس...'' ہاشم کا مصروف سا لہجہ سنائی دیا۔

''آفس میں ہو؟ آ جاؤں؟'' کان کی لو مسلتے ہوئے اس نے سادگی سے پوچھا۔

''میں کولمبو میں ہوں۔ کہو' کیا ہوا؟''

''اوہ۔ تم سے کام تھا۔ خیر تم آ ؤ تو بات کرتے ہیں۔'' وہ گویا فون رکھنے لگا۔

''میرے آئے بغیر' میری ایک کال پہ بھی یہاں سو کام ہو جاتے ہیں۔ تم بولو۔'' ہاشم محتاط انداز میں غور سے سن رہا تھا۔ اپنے سوئیٹ کے صوفے پہ بیٹھا' گرے سوٹ میں ملبوس' ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' وہ پوری طرح تیار تھا۔ اگر سعدی یوسف نے اسے فون کیا ہو تو...؟

''تم نے ایک دفعہ پیشکش کی تھی کہ اگر مجھے نوکری چاہیے تو تم سے...''

''تم میرے پاس کام کرنا چاہتے ہو؟''

''نہیں' تمہارا زیادہ احسان نہیں لینا چاہتا۔'' اکھڑ انداز میں بولا۔ ''مگر کراچی میں جو تمہارا دوست ہے.. ادریس الطاف... سنا ہے اس کو سکیورٹی میں کسی آدمی کی ضرورت ہے۔ اگر تم اس سے بات کرلو۔ تو میں اس کے پاس چلا جاتا ہوں۔''

''تم کراچی جانا چاہتے ہو جاب کے لئے؟'' ہاشم کو اس کے لہجے میں کچھ بھی غیر معمولی نہ لگا تھا۔ وہ عام انداز میں بات کر رہا تھا۔

''پھر اور کیا کروں؟''

''اچھا۔'' ہاشم نے سوچنے کے لیے وقفہ لیا۔

''اگر نہیں کر سکتے تو مجھے بتاؤ' میں تمہارا احسان نہ ہی لوں تو بہتر ہے۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ہاشم نے گہری سانس لی۔

''فارس.. ابھی ایسا کوئی کام نہیں بنا جو میں نہ کر سکوں۔ تم سمجھو کام ہو گیا۔'' ذرا ٹھہرا اور مسکرایا۔ ''مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے مجھے کام کہا۔''

''مجھے خوشی نہیں ہوئی۔ مجبوری نہ ہوتی تو نہ کہتا۔ میری بیوی کا...'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔ ہاشم نے ابرو اٹھایا۔

''کیا اس کی صحت کو کوئی مسئلہ ہے؟ تم بے فکر رہو' ہماری کمپنی اس کے بلز پے کرتی رہے گی' ڈیڈ کی خواہش کے مطابق۔''

''وہ میری بیوی ہے ہاشم' اس کے بلز میں خود پے کرنا چاہتا ہوں۔ تم ادریس الطاف سے بات کرو' میں کل سے ہی کام پہ لگنے کو تیار ہوں۔''

اس کے لہجے میں ہاشم کاردار نے بے چینی محسوس کی تھی۔ وہ مطمئن ہو گیا تھا۔ (وہ لوگ اپنے مسئلوں میں الجھے تھے۔ شاید زمر کی صحت پھر سے خراب ہونے لگی تھی۔ اسے افسوس ہوا مگر اب اس کے بلز تو دے رہا تھا وہ' اور کیا کرتا۔ سعدی نے ان کو کال نہیں کی' اس کی تشفی ہو گئی تھی۔) فون رکھتے ہی اس نے ادریس کو کال ملائی۔ علیک سلیک کے بعد وہ مدعے پہ آیا۔

''فارس غازی.. میرا کزن ہے... وہ تمہارے پاس آئے گا اور تم اس کو رکھ لو گے' چاہے تمہیں ضرورت ہو یا نہیں۔ اور پھر تم اس پہ نظر رکھو گے۔ وہ کیا کرتا ہے' کہاں جاتا ہے' کس سے ملتا ہے' پل پل کی رپورٹ چاہیے مجھے۔'' سخت لہجے میں وہ دوسری طرف کسی کو سمجھا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ایسا نہیں کہ ہم کو محبت نہیں ملی
ہم جیسی چاہتے تھے وہ قربت نہیں ملی

فون بند کر کے فارس گھر کے اندر داخل ہوا تو مصروفیت سی ہر سو بکھری تھی۔ ندرت کچن سے آوازیں دے رہی تھیں' حنین لاؤنج کے شیلف جوڑ رہی تھی' زمر کونے میں کھڑی استری اسٹینڈ پہ کپڑے پریس کر رہی تھی۔ (یقیناً پچھلی رات وہ دونوں کہاں رہے' وہ ان کو مطمئن کر چکی تھی۔) فارس ذرا کھنکھارا۔ بڑے ابا نے اپنے دوائیوں کے باکس سے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا' عینک کے پیچھے سے غور سے۔ وہ سامنے صوفے پہ آ بیٹھا۔ باری باری سب کو دیکھا۔ زمر نے صرف اسے دیکھ کر ابرو اٹھائی (ڈاکٹر سے مل آئے؟) فارس نے سر کو خم دے کر اشارہ کیا۔ (ہاں' سب ٹھیک ہے۔) پھر کچن سے آتی ندرت کی طرف متوجہ ہوا۔ ''مجھے جاب مل گئی ہے۔'' سب رک کر اسے دیکھنے لگے' ندرت

کے چہرے پہ خوشی اتری۔ اس کے قریب آ کر بیٹھیں۔ "اللہ کا شکر ہے۔ یہ تو بہت اچھا ہوا۔ کہاں ملی ہے؟"

"کراچی۔ مجھے کل سے جوائن کرنا ہے۔"

زمر کے ہاتھ پہ استری لگی تھی۔ سس۔ اس نے جلنے والی جگہ لبوں میں دبا لی۔ ندرت کی رنگت پھیکی پڑی۔ حنین بھی فوراً اس طرف گھومی۔

"آپ ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے ماموں؟" بھنویں اکٹھی کر کے بولتی وہ پریشان اور خفا دونوں تھی۔

"تھوڑے عرصے کی بات ہے پھر کوشش کروں گا ادھر ہی پوسٹنگ کروا لوں۔"

"فارس اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے؟" ندرت اس کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھے پریشان سی کہنے لگیں۔

"تو کیا ہو گیا ندرت؟ لوگ نوکری کے لئے دوسرے ملکوں میں بھی جاتے ہیں۔ کوئی انوکھی بات نہیں ہے اس میں۔ اس کو یوں فکر مند نہ کرو۔ سکون سے جاب پہ جانے دو۔ اور خبردار جو تم نے یہاں رونا ڈالا۔" بڑے ابا نے آخری فقرہ حنہ کو دیکھ کر کہا تھا۔ حنین نے پہلے فارس کو دیکھا جو خاموشی سے گردن اٹھائے اسے دیکھ رہا تھا، پھر زمر کو جو سر جھکائے بہت سست روی سے کپڑے استری کر رہی تھی، اور پھر پیر پٹخ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اسے یقین تھا فارس اس کے پیچھے آئے گا، اسے منائے گا، مگر وہ نہیں آیا۔

حنین اپنے کمرے کے دروازے کے ساتھ لگی زمین پہ بیٹھی، خاموشی سے سر گھٹنوں میں دیے رونے لگ گئی۔ وہ انہیں چھوڑ کر جا رہا ہے، اسے پتہ تھا... پہلے ابو، پھر وارث، پھر سعدی، ان کے سارے مرد ان کو چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ کیوں؟ آخر کیوں؟

دوپہر کے کھانے کے بعد جب زمر اپنے کمرے میں داخل ہوئی وہ سامنے کھڑا نظر آیا۔ ایک چھوٹا بیگ بیڈ پہ کھلا پڑا تھا اور وہ سر جھکائے کھڑا اس میں سامان رکھ رہا تھا۔ زمر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور سینے پہ بازو لپیٹے اسے دیکھے.. بس دیکھے گئی۔

"یہ اچانک سے جاب کس نے لگوا کر دی؟" وہ مشکوک تھی۔ (ذہن میں ہارون عبید کا نام گردش کر رہا تھا۔)

"ہاشم نے۔" سنجیدگی سے کہتے اس نے زپ بند کی۔ زمر کا منہ کھل گیا۔

"ہاشم؟ تم ہاشم کے کہنے پہ شہر چھوڑ رہے ہو؟ ہم سب کو چھوڑ رہے ہو؟ تم اس پہ کیسے اعتبار کر سکتے ہو؟" فارس نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"ہاشم میرا کزن ہے۔" پھر آنکھوں کی پتلیاں سکوڑیں۔ "کیوں؟ کیا اس کے بارے میں کچھ ایسا ہے جو میں نہیں جانتا؟"

زمر نے کندھے جھٹکے۔ "مجھے کیا پتہ۔ میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ کل تک تمہارا ناپسندیدہ کزن آج تمہارا بی ایف ایف کیسے بن گیا۔ خیر، تمہاری مرضی جو بھی کرو۔" وہ آنکھوں میں ڈھیروں خفگی لئے ایک ملامتی نظر اس پہ ڈال کر مڑی۔ تبھی سنگھار میز پہ رکھا فارس کا موبائل بجنے لگا۔ زمر قریب کھڑی تھی۔ گردن جھکا کر دیکھا۔ آبدار کالنگ۔ اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"صرف آبدار؟ تو اب تم اس کے ساتھ فرسٹ نیم ٹرمز پہ ہو۔" مڑ کر ایک تیز نظر اس پہ ڈالی۔ وہ خاموشی سے آگے آیا اور فون اٹھا کر اسے سائیلنٹ کر کے جیب میں ڈال لیا۔

"میں چلی جاتی ہوں کمرے سے، تم تسلی سے اس سے بات کر لو۔"

''وہ تو میں تمہارے جانے کے بعد ویسے بھی کرلوں گا۔'' وہ اس کو دیکھ کر مسکرا کر بولا۔

''ظاہر ہے' جیل میں یہ سب تو سیکھا ہو گا تم نے۔'' وہ جبراً مسکرا کر بولی تھی۔

فارس نے ذرا سا اس کی طرف جھک کر مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''تم جل رہی ہو اس سے؟''

''میں؟'' زمر نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ''وہ اس پلاسٹک کی گڑیا سے جلوں گی؟ ہونہہ۔'' اس نے سر جھٹکا۔ ''جلنے کے لئے سامنے والا آپ سے بہتر نہ ہو تو کم از کم آپ کے مقابلے کا تو ہونا چاہیے۔''

''خوبصورت تو خیر وہ بہت ہے۔ اور اس کی سب سے اچھی بات پتہ ہے کیا ہے۔'' اس کے مزید قریب جھک کر سادگی سے بولا۔ ''اس کے بالوں کا رنگ نیچرل سرخ ہے۔ وہ خوبصورت لگنے کے لیے مصنوعی ڈائی نہیں لگاتی۔''

زمر نے بمشکل اپنے بھڑکتے جذبات پہ قابو پایا تھا۔ ''تو تم سارا وقت فون پہ اس سے اس کے بالوں کا رنگ ڈسکس کرتے ہو؟''

''نہیں' اور بھی بہت کچھ کرتا ہوں۔ کام کی ساری باتیں۔ اس نے بہت کچھ کیا ہے میرے لیے۔ ایکچو لی مجھے وہ اپنی ورک وائف لگتی ہے۔''

اس سے زیادہ زمر یوسف اس آدمی کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اسے پرے دھکیلا اور خود دروازے کی طرف بڑھی۔

''اچھا سوری میں مذاق کر رہا تھا' بات تو سنو۔'' فارس نے اسے روکنے کے لیے اس کا ہاتھ پکڑا مگر زمر نے تیزی سے اپنا ہاتھ واپس کھینچا۔

''تم نا مجھ سے دور ہی رہو ورنہ....'' اگلے ہی پل وہ منجمد ہو گئی۔ فارس نے جس ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ رکھی تھی' اس کی آستین پہ خون کے دھبے لگے نظر آ رہے تھے۔

''یہ خون کیسا ہے؟'' اس نے چونک کر فارس کو دیکھا۔ وہ جو مسکرا کر کچھ کہنے لگا تھا' نظریں اپنی آستین تک گئیں' چہرے کی رنگت بدلی' فوراً سے اس کی کلائی چھوڑ کر ہاتھ پیچھے کر لیا۔

''یہ... شاید کان سے آ رہا تھا۔'' اس نے ساتھ ہی دو انگلیاں کان کے پیچھے لگا کر دیکھیں۔

''کیوں؟'' اس نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ ''ٹھہرو مجھے دیکھنے دو۔''

''اب ٹھیک ہے۔ شاید کوئی زخم وغیرہ تھا۔'' مگر وہ آگے آنے لگی تو وہ بولا۔ ''فکر مت کرو' آبدار ایک بہت اچھے ای این ٹی اسپیشلسٹ کو جانتی ہے میں اسے دکھا دوں گا'' اور وہ جو فکرمندی سے آگے کو ہوئی تھی' اس نام پہ رکی۔ ماتھے پہ بل پڑے۔

''ہاں' اسے ہی دکھاؤ۔'' اور برے موڈ کے ساتھ باہر نکل گئی۔

فارس نے بند دروازے کو دیکھتے ہوئے طویل سانس لی' اور پھر سویٹر کی آستین دوبارہ سے موڑلی اور بیڈ کے کنارے آ بیٹھا۔ سر دونوں ہاتھوں میں گرائے' اس نے بند آنکھوں کو مسلا۔

زمر اور حنین.... دونوں اسے بہت عزیز تھیں۔ وہ ان دونوں کو ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا مگر حقیقت کے تیز چمکتے سورج میں کھڑے ہونے کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ بس کچھ دن اور....

"دشمنی.... آج مل سکتے ہو؟" چند منٹ بعد وہ فون پہ کہہ رہا تھا۔

احمر شفیع نے فارس کا فون رکھا اور نظر اٹھا کر سامنے نصب اسکرینز کو دیکھا جن پہ ایک آفس کی مختلف فوٹیج چل رہی تھیں۔ احمر اس وقت کنٹرول روم میں کھڑا تھا اور اس کے چہرے پہ سنجیدگی چھائی تھی۔ بس یک ٹک پتھریلی آنکھوں سے ان فوٹیج کو دیکھ رہا تھا۔ ذہن میں وہ فون کال گونج رہی تھی۔ جو چند گھنٹے پہلے اسے موصول ہوئی تھی۔

"احمر شفیع..." وہ عورت کہہ رہی تھی جو سفید شال میں نیو ائیر پارٹی میں اسے نظر آئی تھی اور جو چترال کے ایک بااثر سیاسی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ "آج صبح جب میرے آفس کی فوٹیج لیک ہوئیں تو میرے سیکیورٹی اسٹاف نے فوراً سے بھاگ دوڑ شروع کر دی کہ معلوم کریں، کس آئی پی ایڈریس، کس سرور، کس جگہ سے ان کو لیک کیا گیا ہے۔ بیک ٹریسنگ اور پتہ نہیں کس کس کام میں لگے ہیں وہ، لیکن میں نے صرف ایک بات سوچی۔ کہ اس سب کا فائدہ کس کو ہو گا؟ اگر اس بات کا جواب ہو تو انسان کو کسی سراغ رسانی کی ضرورت نہیں رہتی۔"

ذرا توقف کر کے وہ بولی۔ "سانپ کو مارتے وقت اس کا سر کچلا جاتا ہے کیونکہ قدیم داستانوں میں آتا ہے کہ اس کی آنکھوں میں اپنے قاتل کی تصویر عکس بند ہو جاتی ہے۔ اور میری آنکھوں میں احمر شفیع تمہاری اور تمہاری مالکن کی تصویر نقش ہو گئی ہے۔"

احمر نے ریموٹ اٹھا کر اسکرینز کو آف کیا، اور موبائل اور چابی اٹھاتا باہر نکل گیا۔ اس کا ذہن اس وقت شدید دباؤ کا شکار تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

منتظر میرے زوال کے ہیں

میرے اپنے بھی کیا کمال کے ہیں

کولمبو کے اس پرتعیش ہوٹل کے تہہ خانے میں اس وقت شدید تناؤ چھایا تھا۔ ہاشم کاردار ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا موبائل کے بٹن دبا رہا تھا۔ نیوی بلیو سوٹ، اسٹرائپس والی ٹائی، ڈائمنڈ کف لنکس پہنے، بال جیل سے پیچھے کو جمائے، وہ اپنی ساری شان و شوکت اور جاہ جلال سے وہاں بیٹھا تھا، گویا پچھلی رات اس کے قیدیوں کا نکل جانا اس کے لئے پریشانی کا باعث تھا ہی نہیں۔

سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوئے لوگوں کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ فصیح بھی پہنچ چکا تھا اور سخت مضطرب دکھائی دیتا تھا۔ ہیڈ شیف تحمل سے بتا رہا تھا کہ فراریوں نے آرڈر پہ تیار کیا کیک کیسے فریج سے غائب کیا اور یہ کہ ان کے ساتھ یقیناً اندر سے کوئی ملا ہوا تھا۔ ہیڈ شیف، فصیح، رئیس، سب اپنی اپنی تھیوریز پیش کر رہے تھے۔ بار بار خاموش ہو کر ہاشم کو دیکھتے۔

"سر؟" فصیح سے مزید برداشت نہیں ہوا تو پکار بیٹھا۔ ہاشم چند منٹ مزید بٹن دباتا رہا، پھر بالآخر سر اٹھایا اور مسکرا کر ان سب کو دیکھا۔

"Sun Tzu قدیم چین کا ایک جرنیل اور فلسفی تھا۔ اس نے ایک مشہور زمانہ کتاب لکھی تھی۔ دی آرٹ آف وار (جنگ لڑنے کا فن)۔"

موبائل میز پہ ڈال کر وہ مسکرا کر گویا ہوا۔ "اس کتاب میں جب وہ یہ بات کہتا ہے کہ جنگ کے دو طریقے ہیں، ڈائریکٹ اور ان ڈائریکٹ لیکن ان دونوں کا "ملاپ" بہترین نتائج سامنے لاتا ہے تو ساتھ وہ مثال دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ..." وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سامنے کھڑے افراد

کی کمریں اور گردنیں مزید سیدھی ہوئیں۔

"کہ میوزیکل نوٹس پانچ سے زیادہ نہیں ہوتے لیکن ان کا ملاپ لامحدود دھنیں بنا دیتا ہے۔" قطار میں کھڑے افراد کے ساتھ سے گزرتا ہوا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا وہ کہہ رہا تھا۔ "وہ کہتا ہے کہ پرائمری کلرز پانچ سے زیادہ نہیں ہوتے...نیلا...سرخ...زرد...سفید اور سیاہ...لیکن ان کا کمبی نیشن لامحدود رنگ بنا سکتا ہے۔" سب توجہ سے اسے سن گئے۔ کمرے میں غیر معمول سناٹا تھا۔

"اور وہ کہتا ہے کہ بنیادی ذائقے پانچ سے زیادہ نہیں ہیں' کھٹا' تیکھا' نمکین' میٹھا' اور کڑوا۔ مگر ان کا ملاپ لامحدود ذائقے بنا دیتا ہے۔" ہاشم نے رک کر گہری سانس لی۔

"ہر چیز بہت پرفیکٹ تھی۔ منصوبہ بندی۔ اس پہ عمل پیرا ہونے کا انداز۔ سب شاندار تھا۔ میں متاثر ہوا ہوں۔ لیکن..." سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے وہ چند قدم مزید آگے آیا۔ سب سانس روکے اسے دیکھ رہے تھے۔

"لیکن ان پانچ ذائقوں میں سے ایک ایسا بھی ہے جو میری بیٹی کو نہیں پسند۔ nuts کا نمکین ذائقہ۔ اس ہوٹل میں جب بھی یہ کیک بنایا جاتا ہے...وہ بلیو بیری کیک جو سعدی کل میری بیٹی کے لیے لایا تھا...اس میں ہیڈ شیف nuts ڈالتا ہے' لیکن پچھلے سال جب سونی نے یہ کیک چکھا تھا تو nuts کے ذائقے پہ اس نے برا منہ بنایا تھا۔ اور اب میں کیا دیکھتا ہوں کہ یہ کیک جو کسی مہمان کے آرڈر پہ تیار کیا گیا تھا' اور جو بظاہر سعدی اور خاور نے چوری کیا تھا' اس کیک میں..." وہ ہیڈ شیف کے سامنے آ کھڑا ہوا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "اس کیک میں nuts نہیں تھے۔"

شیف کا رنگ سفید پڑا۔ ادھر کمرے میں سب چونکے تھے۔ دوسرے ہی لمحے فصیح اس پہ جھپٹا اور اسے نیچے گرایا۔ دو گارڈز بھی اس پہ پل پڑے اور چند ہی لمحوں میں وہ اسکے ہاتھ پیچھے کو باندھ کر اسے قابو کر چکے تھے۔ وہ نفی میں سر ہلاتا کہہ رہا تھا۔

"سر آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں...."

"اونہوں!" ہاشم نے اسی پرسکون چہرے کے ساتھ نفی میں سر ہلایا اور ایک پنجے کے بل زمین پہ بیٹھا۔ "جانتے ہو مسئلہ کیا ہے؟ میرے اور تمہارے جیسے لوگ دوسروں کے ساتھ مخلص ہوں یا نہ ہوں ہم اپنے کام کے ساتھ بے حد مخلص ہوتے ہیں۔ اس کو پرفیکشن کے آخری لیول پہ کرتے ہیں۔ اور ایک بہترین شیف کی انا یہ کہتی ہے کہ جس کے لئے کیک بناؤ اس کو وہ پسند آنا چاہیے۔"

کالر سے نادیدہ گرد جھاڑ کر وہ اٹھا اور بے تاثر سخت نگاہوں سے فصیح کو دیکھا۔

"اس کی چمڑی ادھیڑ دو فصیح۔ یہ جو کچھ جانتا ہے اس سے اگلواؤ۔ زندہ یا مردہ' مجھے ان دونوں کو واپس اس جیل میں دیکھنا ہے۔" پھر ایک قہر آلود نظر اس شیف پہ ڈالی جس کو وہ زنجیر پا کر چکے تھے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

پاؤں رکھتے ہیں جو مجھ پر انہیں احساس نہیں

میں نشانات مٹاتے ہوئے تھک جاتا ہوں

فوڈلی ایور آفٹر ریسٹورانٹ میں اس شام ہلکی پھلکی گہما گہمی تھی۔ سلک شرٹ اور ڈنر جیکٹ میں ملبوس احمر شفیع اندر داخل ہوا‘ شناسائی سے کاؤنٹر والے لڑکے کو ہاتھ ہلایا اور سیدھا زینے اوپر چڑھتا گیا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ اور بے تاثر تھا۔ بالائی ہال کا دروازہ کھولا تو دیکھا‘ وہاں صرف فارس غازی کھڑا تھا۔ گرے سویٹر میں ملبوس‘ سینے پہ بازو لپیٹے وہ احمر کی طرف پشت کیے‘ شیشے کی دیوار سے باہر دیکھ رہا تھا۔ احمر نے دروازہ بند کیا تو فارس اس کی طرف گھوما۔ پھر چہرے پہ سنجیدگی لئے‘ تیکھی نظریں اس پہ جمائے‘ وہ چند قدم آگے بڑھا۔

”کیا حال ہے غازی؟“

”بلایا اور کام سے تھا مگر نیوز میں کچھ دیکھا ہے میں نے‘ ایجنی۔“ وہ تیز لہجے میں بولا۔ ”اور لوگ کہہ رہے ہیں کہ اس میں کاردارز کا ہاتھ ہے مگر کاردارز کا دایاں ہاتھ تو آج کل تم ہو۔ ہے نا؟“

احمر نے بہت ضبط سے اسے دیکھا۔ ”کنسلٹنٹ کلائنٹ پریویلج کے تحت میں اس بات کا جواب نہیں دے سکتا۔“

”اور اس بے ہودہ نخرے کا مطلب دوسرے لفظوں میں ”ہاں“ ہوتا ہے۔“

”ہاں ہو یا ناں‘ تم کیوں جاننا چاہتے ہو؟“

”کیا مطلب میں کیوں جاننا چاہتا ہوں؟“ فارس کی آنکھوں میں غصہ اور تعجب دونوں عود آئے۔ ”منع کیا تھا تمہیں‘ کاردارز کی غلامی مت کرو‘ وہ تم سے ایسے ہی کام کروائیں گے۔ ایک بے قصور عورت کو رسوا کر کے کیا ملے گا تمہیں؟ کرمنل بنتے جا رہے ہو تم!“

احمر لب بھینچے خاموش رہا۔ وہ دونوں چند قدم دور آمنے سامنے کھڑے تھے۔

”اپنا استعفیٰ لکھو اور اپنی مالکن کے منہ پہ مار کر آؤ۔ آج ہی ایجنی۔ تم یہ جاب چھوڑ رہے ہو اور میں تمہارے منہ سے ناں نہیں سنوں گا۔“

”جہاں تک مجھے یاد ہے‘ میں تم سے آرڈر نہیں لیتا‘ فارس غازی!“ اس کا لہجہ اجنبی اور روکھا تھا۔

فارس کے ابرو مزید تن گئے‘ پیشانی کے بلوں میں اضافہ ہوا۔ دو قدم مزید قریب آیا۔

”اور جہاں تک مجھے یاد ہے‘ میں تمہارا دوست ہوں‘ اور تمہیں ایسا انسان نہیں بننے دینا چاہتا جس کو میں پہچانوں بھی نا۔“

”پہچانتا تو میں بھی نہیں ہوں اب تمہیں۔“ احمر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ٹھنڈے لہجے میں بولا تھا۔ لمحے بھر کو فارس کا سانس تھم گیا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”یہی کہ تم خود کیا ہو؟“ احمر کی آواز بلند ہونے لگی۔ ”میں جو کچھ کر رہا ہوں اپنے سروائیول کے لئے کر رہا ہوں‘ میں قانون توڑوں اپنی گردن آزاد رکھنے کے لئے تو وہ غلط... لیکن عظیم فارس غازی وہی کام کرے تو وہ صحیح۔ کیوں غازی؟ کیا تم وہ انسان رہے ہو جو مجھے پہلی دفعہ ملے تھے؟ تب تم نمازیں پڑھتے تھے اب تم ایک athiest بن چکے ہو۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ کیا تم نے ڈاکٹر ایمن کے ہسپتال میں آگ نہیں لگائی تھی؟ کیا وہ جرم نہیں تھا؟ کیا تم انتقام کے نام پہ لوگوں سے جھوٹ نہیں بولتے؟ تم دھوکہ نہیں دیتے؟ کیا معلوم تم نے وہ تینوں قتل بھی کیے

"

ہوں۔ تم کرو تو سب ٹھیک۔ سب Justified۔ کاردارز وہی کام کریں احمر شفیع لوگوں کے ویڈیو اسکینڈل لیک کرے تو وہ غلط۔"

"تم ایک ہی سانس میں مجھے کافر دھوکے باز جھوٹا اور قاتل کہہ رہے ہو۔" فارس سرخ آنکھوں سے غرایا۔ "یہ مت بھولو کہ میرا خاندان تباہ ہوا تھا۔ میں جو بھی کرتا ہوں ان لوگوں کے ہاتھ روکنے کے لئے کرتا ہوں تا کہ وہ ہمیں مزید تباہ نہ کرسکیں۔"

"دو غلط مل کر ایک صحیح نہیں بناتے فارس غازی!" احمر نے زور سے میز پہ ہاتھ مارا۔ وہ دونوں آمنے سامنے سرخ چہروں کے ساتھ کھڑے تھے اور اتنی سردی میں بھی ہال میں شدید گرم سا تناؤ در آیا تھا۔ "اسی طرح کاردارز کے پاس بھی اپنے غلط کاموں کی توجیہات ہوتی ہیں۔"

فارس انگارہ آنکھوں سے اسے دیکھے گیا۔

"یہ... میرا سروائیول ہے۔ یہ میرا سیلف ڈیفینس ہے غازی اور اگر تمہارے لئے یہ درست ہے تو غلط یہ میرے لئے بھی نہیں ہے۔"

"اگر تمہیں یہ دونوں چیزیں ایک جیسی لگتی ہیں اور تم ان دونوں میں فرق نہیں کر سکتے تو میں تمہیں کبھی نہیں سمجھا سکتا۔"

"تم مجھے سمجھانے کی کوشش نہ کرو تو بہتر ہے۔ میں اپنی بقا کے لیے لڑنا سیکھ چکا ہوں۔ اس لئے میرے معاملوں سے دور رہو غازی۔" ایک قہر آلود نظر اس پہ ڈالتا وہ تیزی سے مڑا اور باہر نکل گیا۔ پیچھے لمبے لمبے سانس لے کر خود کو قابو کرتا فارس تنہا کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رات ہر چند کہ سازش کی طرح ہے گہری

صبح ہونے کا مگر دل میں یقین رکھنا ہے

وہ رات کولمبو پہ بھی اتر آئی تھی۔ وہ ابھی تک نہیں سویا تھا۔ یونہی بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ رات بھی آدھی بیت گئی۔ شہر خاموشی میں ڈوبتا گیا۔ تب وہ اٹھا اور بیگ کندھے سے لگائے باہر نکلا۔ سڑک سنسان تھی۔ وہ چوکنا سا آگے بڑھتا گیا۔ بار بار گردن موڑ کر پیچھے دیکھتا۔ چند منٹ بعد وہ ایک ویران گلی میں آگے بڑھتا جا رہا تھا جب دائیں طرف ایک بند بیکری کا بینر دیکھا۔ وہ انگریزی میں لکھا تھا۔ مسٹر بیکر۔ سعدی نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ تیزی سے بیکری کے دروازے تک آیا۔ اس کا لاک عام سا تھا۔ مگر کھولنے کے لیے کوئی تار کوئی پن کوئی بھی چیز دستیاب نہ تھی۔ اس نے پستول نکالا (جس کے اوپر سائیلنسر فٹ تھا) اور لاک کی طرف رخ کر کے ٹریگر دبایا۔ پستول سے آواز نہ آئی مگر اس نے زور کا جھٹکا کھایا۔ وہ پورے کا پورا ہل کر رہ گیا۔ دل تک کانپ گیا۔ مگر خیر.. اب دروازے کو ٹھوکر ماری تو وہ کھل گیا۔

اندر بیکری سنسان تاریک پڑی تھی۔ اس اسٹریٹ کی بہت سی دکانوں کی طرح۔ یہ درمیانے درجہ کی بیکری تھی۔ اس نے لائٹ جلائی تو کمرہ روشن ہوا۔ وہ گھوم کر کاؤنٹر کے پیچھے آیا اور شوکیس کے اندر جھانکا۔ کیکس پیسٹریز۔ براؤنیز۔ اس سے آگے اس نے نہیں دیکھا۔ وہ دو دن کا بھوکا تھا۔ اس نے بیگ پرے رکھا اور ایک بڑا سا کیک باہر نکالا۔ ارد گرد کسی چمچ کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ کچھ خاص نظر نہ آیا تو وہ ہاتھوں سے شروع ہو گیا۔ وحشت سے دیوانہ وار وہ تیز تیز کھاتا جا رہا تھا۔ ساتھ بار بار دروازے کو بھی دیکھتا۔

حنین کی فینٹسی تھی کہ کبھی وہ کسی بیکری میں بند ہو جائے اور پھر.. مزے مزے کی چیزیں بلا روک ٹوک کھاتی جائے کھاتی جائے۔ کس کی

خواہش کس کے نصیب میں لکھی تھی۔

ایک دم سے اسے کسی آہٹ کا احساس ہوا۔ وہ برق روی سے پیچھے کو گھوما اور پستول والا ہاتھ تان لیا۔ دوسرے بازو کی آستین سے منہ پہ لگی کریم رگڑی۔

بیکری کے اندرونی دروازے پہ ایک آدمی شب خوابی کے لباس میں کھڑا تھا۔ اس کے پستول تاننے پہ اس نے ہاتھ اٹھا دیے۔

"ریلیکس ریلیکس..." وہ اسے تسلی دینے کے انداز میں کہنے لگا۔ سعدی سرخ انگارہ آنکھیں اس پہ جمائے پستول تانے رہا۔

"مجھے مت مارنا۔ تم کھالو جتنا کھانا ہے۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔" وہ چوکھٹ میں ہاتھ اٹھائے کھڑا کہہ رہا تھا۔ سعدی اسی طرح پستول اس پہ تانے اسے گھورتا رہا۔

"اس فریج میں صبح کے پیزا رکھے ہیں مائیکروویو میں گرم کرلو ان کو' پیچھے اور ساتھ لے جاؤ۔ میرا دل اتنا چھوٹا نہیں۔ لے جاؤ۔" وہ ہاتھ اٹھائے' نرمی سے کہتا دو قدم مزید آگے بڑھا۔ سعدی نے آہستہ سے پستول والا ہاتھ نیچے کیا۔

"میں بغیر پیسوں کے کچھ نہیں لوں گا۔" ڈیڑھ دن بعد وہ پہلی دفعہ بولا تو احساس ہوا کہ آواز پھٹی پھٹی سی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔ تم جو لے جانا چاہتے ہو لے جاؤ۔ تم برے انسان نہیں ہو' میں دیکھ سکتا ہوں۔ تم صرف بھوکے ہو۔" وہ ہمدردی سے بولا۔

سعدی نے اثبات میں سر ہلایا اور سر جھکا کر شوکیس میں رکھی براؤنیز کو دیکھا۔ "مجھے یہ ایک ڈبے میں ڈال دو۔ جلدی۔"

بیکر ہاتھ گرا کر تیزی سے آگے آیا' ایک ڈبے کا گتا اٹھایا' اس کی اطراف کو موڑ کر اس کو چوکور ڈبے کی شکل دی' پھر سعدی کے ساتھ آ کھڑا ہوا اور جیسے ہی وہ براؤنیز نکالنے کے لئے جھکا' سعدی یوسف نے کہنی اس کی گردن کی پشت پہ ماری' اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا' وہ بیکر کی گردن کو اپنے بازو کے نرغے میں لے کر اس کی مخصوص رگ کو دباتا گیا۔

"تم نے پہلا فقرہ ہی مجھ سے انگریزی میں بولا۔ سنہالی کیوں نہیں بولی' ہاں؟ نیم روشن کمرے میں پہلی دفعہ مجھے دیکھتے ہی تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں انگریزی سمجھنے والا فارنر ہوں' ہاں؟" بیکر ہاتھ پاؤں مارتا رہا' مگر منہ سے آواز تک نہ نکلی' یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو کر ڈھے گیا۔

سعدی نے جلدی سے ٹشو اٹھا کر اپنے کریم والے ہاتھ صاف کیے' پھر جھک کر اس کی جیب تھپتھپائی۔ اندر سے موبائل نکالا۔ نیا پیغام آیا ہوا تھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی سنہالی کے باوجود بیکر کا پیغام اور جوابی پیغام سمجھ لیا۔ اپنے کسی جاننے والے کو "پوسٹر والے لڑکے" کی اپنی بیکری میں موجودگی کی اطلاع دے رہا تھا۔

کسی احساس کے تحت سعدی اٹھا اور بیکری کی بتیاں جلائیں۔ تلاش کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ کیش کاؤنٹر کے اوپر ہی اس کا پوسٹر لگا تھا۔ وہ 100 فیصد اس کی شکل نہیں تھی' مگر سیاہ رنگ سے کھینچا خاکہ' گھنگریالے بال' بھوری آنکھیں' گوری رنگت' اٹھی ہوئی ناک... نوے فیصد وہ سعدی ہی تھا۔ اس پوسٹر پہ لکھا تھا کہ وہ تامل ٹائیگرز کا جاسوس ہے (تامل ٹائیگرز سری لنکا میں وہی تھے جو پاکستان میں تحریکِ طالبان ہے۔ فرق اتنا ہے کہ تامل ٹائیگرز 2009 میں مکمل طور پہ پسپا ہو چکے تھے۔) اور وہ تامل تحریک کو پھر سے اٹھانے کے لیے سرگرم کارکنوں

کے ساتھ کام کر رہا ہے۔اس کی گرفتاری پہ بھاری انعام رکھا گیا تھا۔ساتھ ایک فون نمبر بھی درج تھا۔ڈیم اِٹ۔سعدی نے تیزی سے وہ پوسٹر پھاڑ کر اتار لیا (اوپر لکھے فون نمبر کے دو ہندسے دیوار سے لگے رہ گئے۔)

پوسٹر بیگ میں ڈال کر وہ تیزی سے باہر نکلا۔ابھی تک گلی سنسان تھی۔اسے پکڑنے آنے والوں کو ابھی (پیغام کے مطابق) 10 منٹ لگنے تھے۔مین روڈ سے اس نے ٹک ٹک پکڑا' اور اس میں بیٹھ گیا۔اب وہ جھک کر' بیگ کو خود سے لگا کر نہیں بیٹھا تھا۔اب وہ گردن اٹھائے' سنجیدہ اور ہوشیار سا بیٹھا تھا۔رستے میں اس نے تین رکشے بدلے۔

آدھے گھنٹے بعد وہ اس جگہ سے کافی دور' ایک فلیٹ بلڈنگ کی تیسری منزل میں ایک اپارٹمنٹ کا تالہ کھول کر اس کے اندر کھڑا تھا۔پوری عمارت میں صرف یہی فلیٹ یوں لگتا تھا کہ مکینوں سے خالی ہے۔(اس کی بالکونی میں رکھے پودے سوکھ رہے تھے۔گویا سارا خاندان جلدی میں گھر سے گیا ہو' کوئی ناگہانی آ گئی ہو اور ابھی تک واپس نہ آ سکا ہو۔)

اس نے مختلف الماریاں کھولیں۔کپڑے دیکھے۔جوتے دیکھے۔لاؤنج میں پڑا فون بھی دیکھا۔مگر اس کو چھوا تک نہیں۔پھر وہ ایک باتھ روم میں چلا گیا۔

چند منٹ بعد جب وہ باہر نکلا تو بڑھی ہوئی شیو ویسی ہی تھی البتہ۔گھنگریالے بالوں پہ گویا استرا پھیر کر ان کو بہت چھوٹا کر چکا تھا۔شاید ناخن سے بھی آدھے رہ گئے ہوں۔نئی جینز شرٹ میں ملبوس' اس نے باہر آ کر بوٹ پہنے۔اور آئینے میں خود کو دیکھا۔اب وہ اسکیچ والے سعدی سے کافی مختلف لگ رہا تھا۔

وہ رات سعدی اسی فلیٹ میں رہا۔ان کا کمپیوٹر اس نے کھول کر' پاسورڈ اڑا کر' انٹرنیٹ کھولا۔اپنا کوئی میل اکاؤنٹ وہ لاگ اِن کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔اس نے ندرت کی فیس بک آئی ڈی کھولی۔(یہ کسی زمانے میں امی کو بنا کر دی تھی' بیرونِ ملک رشتے داروں کی تصاویر دیکھنے' ان پہ چھوٹی تعریفیں لکھنے اور اپنے ریسٹورانٹ کے پیج پہ لوگوں کے اچھے ریویوز پڑھ کر خوش ہونے کے لئے وہ اسے استعمال کرتی تھیں۔) پاسورڈ سعدی کے پاس تھا۔اس نے ڈالا اور پھر...گویا ایک نئی دنیا کھل گئی۔

وہ ایک کے بعد ایک گھر والے کی آئی ڈی دیکھتا رہا۔سب کی ٹائم لائن بھری ہوئی تھی۔تصویریں' چیک اِن' کون کہاں گیا' کس کی سالگرہ ہوئی' کس نے کس کو ٹیگ کیا۔حنین اور زمر کی اکٹھی مسکراتی ہوئی سیلفی...(یہ دونوں..ایک دوسرے کے ساتھ اتنی خوش؟) اسامہ کی تصویر ...(یہ..اتنا بڑا؟ اتنا لمبا؟) اور پھر..فارس کی پروفائل..اس میں کچھ خاص نہ تھا..وہ کم ہی لاگ اِن کرتا تھا..مگر اوپر اوپر اسامہ نے پوسٹ کی ہوئی تھی۔"ماموں..کراچی نہ جائیں۔" فارس نے کوئی کمنٹ نہیں کیا تھا مگر نیچے حنین اور زمر کے جوابات تھے۔زمر کہہ رہی تھی کہ وہ فارس کو تنگ نہ کرے' اور حنہ نے خفگی سے زمر کو فارس کی سائیڈ نہ لینے کا کہا تھا۔

وہ بالکل چپ بیٹھا رہا۔سارے حساب الٹے ہو گئے تھے۔زندگیاں بدل گئی تھیں۔وہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔وہ سب آگے نکل گئے تھے۔ان کی زندگیاں کتنی پرسکون' اور صاف ستھری تھیں۔

فارس... جو جیل میں تہجد اور فجر پڑھا کرتا تھا اب بھی اس کا ایمان ایسا ہی مضبوط تھا۔ ہر قسم کے کفر سے پاک۔

حنین.. اس کی بہن.. جس کی پروفائل پہ فجر کی نماز سے متعلق احادیث لکھی تھیں۔ وہ کتنی سچی سی حنہ تھی۔ ہر طرح کے جھوٹ سے پاک۔

زمر.. صاف' کھری' نڈر سی زمر' جو ہر فریب سے دور تھی۔ ہر مکر سے پاک تھی۔

اور وہ خود.. اس نے سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ وہ ایک قاتل تھا۔

اس نے مڑ کر ایک دفعہ پھر لاؤنج میں پڑے فون کو دیکھا۔ مگر پھر سر جھٹک کر ارادہ بدل دیا۔

وہ اپنے گھر واپس نہیں جا سکتا تھا۔ وہ ان کی طرح روشن' نیک اور صاف ستھرا نہیں رہا تھا۔ اس کے اندر کے اندھیرے اس کے اپنوں کی ساری روشنی نگل لیں گے۔

یوں سعدی یوسف نے رہائی کے بعد کسی کو کال نہیں کی۔ اسے کرنی ہی نہیں تھی۔ صبح وہ اس فلیٹ سے باہر نکلا اور کیب لے کر کولیو فورٹ کے ٹرین اسٹیشن کی طرف آ گیا۔ بالکل کراچی یا لاہور کے جیسا اسٹیشن تھا۔ مگر ذرا صاف ستھرا زیادہ تھا۔ پہلے وہ اسٹال کی طرف آیا۔ موٹے فریم کا چشمہ خریدا اور اسے آنکھوں پہ لگایا' پھر پی کیپ ماتھے پہ مزید جھکا کر ٹکٹ ونڈو تک آیا۔ لائن میں تب کھڑا ہوا جب سب سے آخر میں اس نے ایک لڑکی کو کھڑے دیکھا۔ وہ ساتھ کھڑے لڑکے سے بات کر رہی تھی۔

''اوہ گاڈ'' وہ جیب تھپتھپا کر اونچا سا بولا۔ ''میں اپنا سیل فون شاپ پہ چھوڑ آیا۔'' وہ دونوں مڑ کر اس کا پریشان چہرہ دیکھنے لگے۔

''آپ میرے لیے کینڈی کا ٹکٹ خرید دیں گی۔ پلیز۔ میں سیل فون لے آؤں۔'' جلدی جلدی چند نوٹ اسے تھما کر وہ مڑ کر بھاگا۔ لڑکی حیران رہ گئی مگر لڑکے نے اسے تسلی دی کہ وہ اس کے لئے ٹکٹ لے لیں گے۔

جب اس نے دیکھا کہ ان کی باری آ چکی ہے اور وہ ٹکٹ لے چکے ہیں' تب وہ واپس ان تک آیا اور بہت ہی مایوسی سے بتایا کہ وہ سیل کھو چکا ہے۔ انہوں نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اس کے بقایا پیسے اور ٹکٹ اسے تھمائے' جنہیں لے کر وہ پھر سے وہاں سے غائب ہو گیا۔ ٹرین کی روانگی تک وہ ایک باتھ روم میں دروازہ بند کر کے کھڑا رہا' اور جیسے ہی وقت قریب آیا' وہ باہر نکلا اور ٹرین میں جا سوار ہوا۔ نہ کسی نے اسے دیکھا' نہ کسی نے اسے محسوس کیا۔ وہ ایک کونے کی سیٹ پہ بیٹھ گیا اور اخبار' وہ کسی مسافر نے نہیں چھوا تھا کہ ہر کوئی اپنے اسمارٹ فون کے ساتھ لگا تھا' کو چہرے کے سامنے پھیلا لیا۔

دو منٹ بعد ٹرین چل پڑی.. اور اسے کولیبو سے دور لے گئی.. دور... بہت دور...

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ دن ہیں کہ یاروں کا بھروسہ بھی نہیں ہے
وہ دن تھے کہ دشمن سے بھی نفرت نہیں ہوئی تھی

ہوٹل کی زیر زمین جیل میں فصیح سعدی کے کمرہ جس میں کھڑا تھا اور اس کی چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں تین

افراد اس شیف کو باندھ کر اس کے چہرے پہ کپڑا ڈالے اس پہ بار بار گرم پانی ڈال رہے تھے اور وہ درد سے کراہتا بے ربط الفاظ بولے جا رہا تھا۔

میری فصیح کے ساتھ کھڑی تھی اور اس کو سعدی کی چیزوں کا معائنہ کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

''وہ یہاں سے کچھ بھی نہیں لے کر گیا' سوائے ان کاغذات کے جن پہ وہ کچھ لکھا کرتا تھا۔''

''ہوں۔'' فصیح نے ہنکارا بھرا' پھر سر اٹھا کر میری کو دیکھا۔ ''تم اوپر چلی جاؤ۔ تم کاردار صاحب کے ساتھ واپس جاؤ گی۔''

میری کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ''مگر میں نے ان کو مایوس کیا ہے۔ میری مخبری کی وجہ سے وہ اس کمرے تک پہنچے اور وہاں سے بھاگے۔''

''مگر تمہاری نیت صاف تھی۔ جاؤ' کاردار صاحب اوپر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔ میری آنکھوں کو پونچھتی باہر نکل گئی۔ فصیح موبائل پہ بٹن دباتا باہر آیا اور لفٹ کی طرف بڑھتے' دوسری جانب جاتی گھنٹی سنتا رہا۔

''سر' ایک اہم بات ہے۔'' لفٹ میں داخل ہو کر وہ مدھم آواز میں بولا تھا۔

''کیا ہوا فصیح؟'' ہارون مصروف لہجے میں بولے تھے۔

''شیف ٹوٹ چکا ہے۔ سب اگل دیا ہے۔ لیکن زہریلی سرنج کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا۔ سر۔'' وہ متذبذب سا رکا۔ ''سعدی یوسف کے سامان میں دو چیزیں مسنگ ہیں۔ ایک اس کے کاغذ' دوسرا مس آبدار کا پین۔ مس اپنی نوٹ بک اس کے پاس چھوڑ گئی تھیں۔ میں وہ لینے لگا تو وہ پین یاد آیا۔ صرف وہی پین تھا جو سیکیورٹی پوائنٹ پہ چیک نہیں کیا گیا تھا۔ میرا خیال ہے مس آبدار نے اس میں زہر.....''

''آج تو تم نے میری بیٹی پہ الزام لگا دیا ہے' آئندہ کبھی مت لگانا۔'' وہ ایک دم گرج کر بولے تھے۔ ''وہ میرا پین تھا' اور وہ سعدی نے نہیں رکھا تھا۔ آبی اسے واپس لے آئی تھی۔ تمہاری یادداشت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اپنی ناک کے نیچے سارا کھیل رچاتے شیف کو تم پکڑ نہیں سکے' اور میری بیٹی پہ الزام لگاتے ہو؟''

فصیح کے ایک دم پسینے چھوٹ گئے۔ رنگت متغیر ہوئی۔ ''سوری سر' میرا یہ مطلب...'' مگر ہارون اس کے سارے خاندان کو مغلظات سے نوازکر اسے گویا ادھ مویا کر کے فون بند کر چکے تھے۔

وہ اس وقت اپنے آفس میں بیٹھے تھے۔ فون بند کر کے انہوں نے ریموٹ اٹھایا اور دیوار گیر کھڑکی کی طرف کر کے بٹن دبایا۔ بلاک آؤٹ بلائنڈز فوراً سے کھڑکیوں پہ گرنے لگے یہاں تک کہ ساری روشنی ختم ہو گئی اور آفس میں اندھیرا چھا گیا۔ ہارون ٹیک لگائے' تھوڑی مسلتے' چھت کو دیکھتے کتنی ہی دیر سوچتے رہے۔ پھر انہوں نے انٹرکام اٹھایا۔

''آفتاب کو بلاؤ۔''

آدھے گھنٹے بعد... وہ اسی طرح اندھیرا کیے' کرسی پہ ٹیک لگا کر بیٹھے تھے جب آفتاب اندر داخل ہوا۔ وہ دبلا پتلا' ادھیڑ عمر شخص تھا اور اچھا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ہارون نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا۔

"میری بیٹی نے مجھے صبح اطلاع دی تھی کہ وہ چند دن کے لئے میرا بزنس جیٹ لے کر جا رہی ہے۔ اس نے میرے عملے کو بھی چھٹی دے دی ہے..... مجھے معلوم ہے وہ کسی ایسے شخص کو اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتی ہے جس کے بارے میں وہ مجھے نہیں بتانا چاہتی۔"

آفتاب توجہ سے سن رہا تھا۔

"وہ اپنے قابل بھروسہ لوگوں کو عملے میں رکھے گی۔ وہ تم پہ بھروسہ کرتی ہے۔ اکثر تمہیں کام کہتی رہتی ہے۔ تم اس عملے میں شامل ہو گے۔"

"اور میں آپ کو معلوم کر کے دوں گا کہ وہ کس کو اپنے ساتھ لے جا رہی ہیں؟"

"میں پہلے سے ہی جانتا ہوں کہ اس کا نیا دوست کون ہے اور یہ بھی کہ وہ کولمبو کیوں جانا چاہتا ہے۔ تم بس کولمبو میں آبی کے قریب رہو گے' اور اس کی حفاظت کرو گے۔" ان کا چہرہ اندھیرے میں تھا اور دن کے اوقات کے باوجود آفتاب کو ان کا چہرہ دیکھنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دھیان اور غور سے سنتا گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اب سانس کا احساس بھی اِک بارِ گراں ہے
خود اپنے خلاف ایسی بغاوت نہ ہوئی تھی

میری انجیو نے اس روز یونیفارم کی بجائے سادہ بھوری اسکرٹ' بلاؤز کے سیاہ لمبی جرابیں پہنی تھیں۔ جس وقت وہ کار سے نکل کر سبزہ زار پہ کھڑی ہوئی اس کی گردن خود بخود قصرِ کاردار کو دیکھنے... نگاہوں میں سمونے کے لئے... اوپر اٹھتی گئی۔ دھند اور سرخ شام کے ڈھلتے موسم میں پوری شان سے کھڑا او نچا محل روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اگلی کار سے ہاشم اور جواہرات نکلے تھے۔ سونی آگے بھاگ گئی تھی۔ وہ دونوں باتیں کرتے قصر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میری نے گردن سیدھی رکھی' اور دلی جذبات پہ قابو پاتی' ہمت مجتمع کر کے ان کے پیچھے چل پڑی۔ رواج کے مطابق خوش آمدید کہنے ملازم دروازے پہ آ کھڑے ہوئے تھے۔ فیونا بھی ان میں سے ایک تھی۔ سب سے آگے' وہ اعتماد سے مسکرا کر جواہرات کا استقبال کر رہی تھی۔ دونوں ماں بیٹا اسی بے نیازی سے اندر داخل ہوئے اور فیونا نے دیکھا ان کے پیچھے میری انجیو چلی آ رہی ہے۔ فیونا یکدم بت بن گئی۔ بالکل منجمد۔ میری قدم بقدم چلتی قریب آئی۔ اس کے ادھیڑ عمر چہرے پہ فیونا کے مقابلے میں ڈھیروں لکیریں اور تجربے کے بل پڑے تھے۔ سنجیدہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے فیونا کو دیکھا۔

"بہروز سے کہو میرا کمرہ تیار کرے۔" تحکم سے کہا تھا۔ فیونا نے مڑ کر جواہرات کو دیکھا جو اندر جا رہی تھی اور پھر بے بسی بھرے تعجب سے واپس میری کو۔

"بہروز... سارا پرانا اسٹاف... اب یہاں جاب نہیں کرتا۔" پھر ذرا اعتماد سے بولی۔ "اب یہاں کا اسٹاف بدل گیا ہے میری انجیو۔"

"بہت اچھے۔ اس بدلے ہوئے اسٹاف کے لوگوں سے کہو میرا کمرہ تیار کریں اور یہ بھی کہو' صبح منہ اندھیرے وہ اٹھ کر تیار ہو جائیں' کل میں سارے گھر کے اِن ڈور پلانٹس کی جگہیں بدلنا چاہوں گی۔" پھر ایک طائرانہ نظر برآمدے پہ دوڑائی۔ "اور ادھر کے سارے پودے

کہاں گئے؟ میں چند دن کے لئے کیا گئی‘ تم لوگ تو نکمے ہو گئے ہو....‘‘ ڈپٹ کر بولتی وہ اندر بڑھ گئی۔ فیونا ہکا بکا سی ساکت کھڑی رہ گئی۔

اندر اپنے کمرے کی طرف بڑھتی جواہرات کہہ رہی تھی۔ ’’میری.... مساج کے لئے سامان تیار کرو۔ میرے پیر بہت درد کر رہے ہیں۔‘‘ اور اوپر سیڑھیوں کے زینے چڑھتے ہاشم نے آواز لگائی تھی۔ ’’میری.... بلیک کافی بھیجو میرے کمرے میں فافٹ۔‘‘ اور میری انجیو مسکرا کر‘ سر کو خم دیتی‘ دونوں کو جواب دیتی آگے بڑھ گئی تھی۔

پہلے احمر شفیع اور اب میری انجیو.... فیونا کا سارا وجود مین پوس ہو گیا تھا۔

اپنے کمرے کے دروازے کے قریب ہاشم رکا۔ سامنے سے نوشیرواں چلا آرہا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا‘ پھر ہاشم تنے تاثرات کے ساتھ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اسے امید تھی کہ شیرو معذرت کرنے پیچھے آئے گا مگر چند لمحے بعد زینے اترنے کی آواز نے اس کے دل کو دھکا سا لگایا۔ مگر وہ بہت مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ کوٹ اتارتے ہوئے اس نے دروازہ بند کر دیا۔

زندگی اس کے لئے معمول پہ آچکی تھی۔ سعدی یوسف کے بھاگنے کے بعد اسے اگلا کارڈ کون سا کھیلنا تھا‘ اب اسے یہی سوچنا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اب تیرے قریب آ کے بھی کچھ سوچ رہا ہوں
پہلے تجھے کھو کر بھی ندامت نہ ہوئی تھی

ائیرپورٹ جانے سے پہلے‘ گھر کے اندر سب سے مل کر خدا حافظ کہہ کر اب وہ پورچ میں آ کر کار میں سامان رکھنے لگا تھا اور جانتا تھا کہ اس سے اس وقت کوئی خوش نہیں تھا۔ اس نے سارہ کو فون کرنے کا سوچا پھر رہنے دیا۔ وہ اسے اس کے حال پہ چھوڑ چکا تھا۔

موبائل نکال کر اس نے کال ملائی اور تھوڑی دیر کے لیے گیٹ سے باہر جا کر بات کرنے لگا۔

’’میں پھر سے دہرا رہا ہوں۔ تم چوبیس گھنٹے میرے گھر کے باہر رہو گے۔ میرے گھر کون آتا ہے‘ یہاں سے کون کہاں جاتا ہے‘ تم ان پہ نظر رکھو گے۔ قادر میرے بھانجے کے قریب رہے گا۔ جب تک وہ اسکول میں ہوگا‘ وہ اسکول کے باہر کھڑا رہے گا۔ میں کچھ دن میں آجاؤں گا‘ لیکن میرے پیچھے تم لوگ میرے گھر والوں کی حفاظت کرو گے۔‘‘ اور دوسری طرف موجود بندہ اسے تسلی دے رہا تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔

زمر نے ائیرپورٹ تک کی ڈرائیو خاموشی سے طے کی وہ بھی چپ سا کھڑکی کے باہر دیکھتا رہا۔ صرف حنین ساتھ آئی تھی اور پیچھے چپ بیٹھی تھی۔ فارس نے اس سے ابھی تک بات نہیں کی تھی۔

پھر احاطے کے اندر آ کر.. ڈھیروں مسافروں کے درمیان... زمر اس جگہ رکی جہاں سے آگے وہ نہیں جا سکتی تھی۔ وہ بھی ٹھہر گیا۔ کچھ دیر دونوں خاموش کھڑے رہے۔

’’تو طے ہوا کہ تم نہیں رکو گے۔ بھلے کوئی کتنا ہی روکے!‘‘ سینے پہ بازو لپیٹے وہ اس کے مقابل کھڑی‘ اداس مسکراہٹ کے ساتھ پوچھنے لگی۔

’’کسی نے روکا ہی نہیں تو کیسے رکتا؟‘‘ اس نے مسکراہٹ دبائی۔

زمر بس یاسیت سے اسے دیکھتی رہی۔ "مت جاؤ۔"

"آجاؤں گا واپس۔" اس نے نظریں چرائیں۔

"اور اگر جو نہ آئے فارس..." وہ بے بسی سے دونوں ہاتھ اٹھا کر بولی تھی۔ جیسے اپنی بات کی وضاحت نہ کر پا رہی ہو۔ "مجھے لگتا ہے میں تمہیں کھو دوں گی۔"

"تم سب محفوظ ہو۔ پہلے نہیں تھے۔ اب ہو۔ کیونکہ اب ہم سب اکٹھے ہیں۔" ارد گرد موجود لوگوں سے قطعاً بے نیاز ہو کر اس نے زمر کے دونوں ہاتھ تھامے۔ اسے پرواہ نہیں تھی کوئی دیکھ کر کیا سوچتا ہے۔ ہاتھ تھامنے کا مطلب صرف رومانس تو نہیں ہوتا۔ جیسے بھائی بہن کا' یا باپ بیٹی کا ہاتھ تھام کر اسے حفاظت اور بھروسے کا احساس دلاتا ہے' ویسے ہی شوہر اور بیوی کے رشتے میں (اگر بالی وڈ کی عینک اتار کر تم دیکھو) تو دوستی' اعتماد' حفاظت' مان' یہ سب ہوتا ہے' اور رومانس تو ایک بہت ثانوی چیز بن کر رہ جاتا ہے۔

اور اس وقت وہ خود کو جتنا کمزور محسوس کر رہی تھی' فارس کا یوں ہاتھ تھام کر احساس دلانے سے.. اس کی آنکھیں جانے کیوں بھیگ گئیں۔ سرخ گڑیا سے جڑی ساری تلخی ہوا ہوئی۔

"پچھلے ساڑھے چار سال اچھے گزرے فارس۔ میں ان سیکیور نہیں محسوس کرتی تھی خود کو۔ کھونے کے لئے کچھ رہا ہی نہیں۔ مگر اب... ماہ کامل کے بعد سے.. اس رشتے کے بعد سے... کھونے کے لئے بہت کچھ آ گیا ہے زندگی میں۔ پلیز جلدی واپس آ جانا۔" وہ دکھی دل سے کہہ رہی تھی۔ آج اس سے لڑنے کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"تو تم مجھے مس کرو گی؟" وہ مسکرایا۔ مگر خوش وہ بھی نہیں تھا۔

"میں تمہیں مس کیوں کروں گی؟" زمر نے مسکراہٹ دبائے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے نکالے۔ "آئی ہیٹ یو۔" اور فارس غازی نے سر کو خم دیا۔

"آئی لو یو ٹو!" اور بیگ اٹھا کر کندھے پہ ڈال لیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس دی۔ گردن پیچھے کو پھینک کر محظوظ ہو کر۔ پھر اسے دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ مسکرا کر۔ محظوظ ہو کر۔ زمر کے دل میں ایک دم بہت سے واہمے در آئے۔

"تم ایسے ہی واپس آؤ گے نا؟ بدل تو نہیں جاؤ گے؟"

"نہیں۔" اس نے مسکرا کر تسلی دی۔ پھر اس کی طرف جھکا۔ "اور میں اس کو دن میں تین چار کی بجائے صرف ایک یا دو کالز کیا کروں گا۔"

"ہاں ہاں کر لینا۔" وہ پھر ہنس دی تھی۔ وہ اسے صرف ستا رہا ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ اس نے خود کو تسلی دے دی اور پھر مڑ آئی۔ اس کو دور جاتے دیکھنا مشکل تھا۔ خود دور جانا زیادہ آسان تھا۔

حنین اس کی منتظر تھیں۔ وہ چپ چاپ اس سے آملی۔ ماحول بوجھل سا تھا۔ اور پھر اسی بوجھل ماحول میں وہ دونوں گھر جانے کے بجائے ایک ریسٹورانٹ میں آ بیٹھیں۔ حنین نے آرڈر دیا اور زمر گھنگریالی لٹ انگلی پہ لپیٹتی' خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی۔

''مبارک ہو۔ آپ کا شوہر بھاگ گیا' اور میرا بھائی ابھی تک گمشدہ ہے۔'' حنہ نے تھوڑی دیر بعد جلے کٹے انداز میں کہا۔

''ہم دونوں ناکام عورتیں ہیں کیونکہ ہمارے سب سے عزیز مرد ہمیں چھوڑ جاتے ہیں۔'' وہ خفگی سے بول رہی تھی۔ ''فرعون بھی تو یہی کرتا تھا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے... بار بار... کہ بنی اسرائیل... وہ تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے تھے اور بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے۔''

''بیٹیوں کو نہیں' عورتوں کو۔'' زمر نے دھیمی آواز میں تصحیح کی مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔

''یہ عذاب تھا بنی اسرائیل کا۔ ایسی ذلت کہ کوئی آپ کے مردوں کو مار دے' اور عورتوں کو چھوڑ دے۔ اکیلی عورتوں کو۔ بنی اسرائیل کی بے بسی اور لاچاری تو دیکھو۔ بالکل ہماری طرح۔''

''ہاں ٹھیک ہے یہ آیت ''یقتلون ابنائکم و یستحیون نسائکم'' بنی اسرائیل کی بے بسی بیان کرتی ہے' مگر اس کے اور زاویے بھی ہیں۔'' زمر نے نرمی سے اسے مخاطب کیا۔

''مثلاً کون سے؟'' وہ سخت جلی کٹی بیٹھی تھی۔ فارس اس سے بات تک نہیں کر کے گیا تھا۔

''بہت سے ہوں گے نا حنین۔'' وہ جیسے اس ذکر سے احتراز برت رہی تھی۔ اتنے برس سخت دل کے ساتھ گزارے تھے' اب کیا پگھلنا؟

''آپ بتائیں میں سن رہی ہوں۔'' حنہ نے لہجہ ذرا دھیما کیا۔

''ہر آیت کے بہت سے رموز' بہت سے زاویے ہوتے ہیں۔''

''ایک منٹ زمر۔ میں نے ایک بات بھائی سے کبھی نہیں پوچھی' پہلے ضرورت نہیں پڑی لیکن اب میں خود کنفیوز ہو رہی ہوں کہ جیسے بھائی کی فیس بک پہ تفسیر ویڈیوز ہیں....'' وہ ذرا ہچکچائی... ''ہم جیسے عام لوگ قرآن کی تفسیر کیسے کر سکتے ہیں؟''

زمر دونوں کہنیاں میز پہ جمائے آگے کو ہوئی اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ ''ہم جیسے عام لوگ قرآن کی تفسیر کر بھی نہیں رہے۔ تفسیر تو مفسر کرتے ہیں۔ عربی گرامر' صرف نحو' وغیرہ کی باتیں۔ حقائق کے حوالہ جات۔ آیات کا شانِ نزول وغیرہ بتانا۔''

''تو پھر وہ جو بھائی کے فیس بک گروپ میں اس کی ویڈیوز ہیں' وہ کیا ہے؟''

زمر لمحے بھر کے لئے چپ ہوئی۔ آنکھیں نیچے جھکا کر اس نے گویا کچھ سوچا۔ حنہ کے ماتھے کے بل غائب ہونے لگے۔ اور اس کی اپنی آنکھوں میں دلچسپی اتری۔ پھر زمر نے آنکھیں اٹھائیں۔ (فارس کے جانے کا غم دونوں کے دل سے لمحے بھر کو نکل گیا۔)

''ہمارے رسول اللہ ﷺ نے کبھی اپنے آپ کو مفسر نہیں کہا تھا۔ قرآن ایک علمی کتاب بھی ہے' لیکن یہ 'صرف' علمی کتاب نہیں ہے۔ کیا اللہ نے قرآن میں یہ نہیں فرمایا کہ... (قدرے وقت سے اس نے آیت دہرائی' یہ نہیں تھا کہ آیت یاد نہیں تھی بلکہ بس اس کا یاد آنا اور خود کو یاد دلانا مشکل لگ رہا تھا) یعنی ہم نے نازل کی آپ پر یہ کتاب جو مبارک ہے' تاکہ آپ اس میں تدبر (غور و فکر) کریں اور اس کے ذریعے عقلمند لوگ نصیحت پکڑیں۔ تو حنین' ہم لوگ قرآن کی تفسیر نہیں کر سکتے' مگر اس کی آیات کے معانی کے اندر رہ کر اس میں تدبر تو کر سکتے ہیں اور اس کی دعوت خود قرآن ہر انسان کو دیتا ہے۔ اللہ کے نزدیک سب برابر ہیں۔ کوئی پیدائشی عام یا خاص نہیں ہوتا۔ اور اگر ہم اس کی ایک

ایک آیت کو اپنی زندگی سے ریلیٹ نہیں کریں گے تو نصیحت کیسے پکڑیں گے اس سے؟ دیکھو میں واقعی بہت نیک نہیں ہوں' اس کو پڑھتی بھی نہیں ہوں اب۔ مگر میں جو قرآن کا مقصد سمجھی ہوں وہ یہ ہے کہ یہ ہر انسان کے لئے نصیحت ہے۔ یہ صرف "تفسیر" نہیں ہے۔ یا یہ صرف علمی کتاب نہیں ہے۔" حنین پیچھے ہو کر بیٹھی۔ ویٹر آرڈر سرو کرنے لگا مگر زمر ادھر متوجہ نہیں تھی۔ (اچھی بات ہے۔) حنہ نے اپنی پلیٹ سیٹ کرتے ہوئے کہا۔

"زمر لیکن اگر ہر انسان خود سے تدبر کرنے لگے گا تو کیا یہ صحیح ہوگا؟ کیونکہ اللہ اسی قرآن کے ذریعے لوگوں کو بھٹکاتا بھی ہے۔"

"تو پھر ہر قرآن پڑھنے والا بھٹک کیوں نہیں جاتا؟" وہ اب زیادہ روانی سے بول رہی تھی۔ "لوگوں نے اس آیت کو بہت غلط استعمال کیا ہے کہ چونکہ قرآن سے بندہ بھٹک بھی سکتا ہے اس لئے اس کو صرف کھول کر پڑھو اور پھر چوم کر کسی اونچی جگہ پہ رکھ دو۔ دیکھو حنہ... کوئی شخص کسی راستے پہ سفر کرنے نکلے تو یا تو وہ بھٹکے گا' یا منزل تک پہنچ جائے گا۔ بھٹکنے کے ڈر سے اب کوئی سفر ہی نہ کرے کیا؟ لوگ تو روز سفر کرتے ہیں۔ کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ جو سائن بورڈز دیکھ کر سفر کرے گا' کامن سینس یوز کرے گا' وہ نہیں بھٹکے گا۔"

"میں بحث نہیں کرنا چاہ رہی زمر۔" حنہ نے مزے سے پلیٹ میں اچھی اچھی اسٹیکس نکالیں فرنچ فرائز بھرے' ساس ڈالی اور پھر سرسری انداز میں بولی۔ "مگر... اس طرح اگر ہر شخص قرآن کی تفسیر..." وہ رکی اور تصحیح کی۔ "قرآن میں تدبر کر کے اس کو بیان کرنا شروع کر دے' یعنی اپنی رائے پہ بیان کرنے لگ جائے... تو..."

"اپنی رائے پہ تو کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ قرآن میں ہے نا وہ کہ جہنم والے کہیں گے ہم قیامت کو جھٹلاتے رہے۔ یہاں تک کہ آ گیا ہم کو الیقین۔ اب الیقین کا مطلب "موت" ہے۔ آپ اس کا مطلب "یقین کر لینا" نہیں لے سکتے۔ آپ کو اس آیت کے اندر رہ کر اس کے مطلب کے دائرے میں رہ کر ہی تدبر کرنا ہے' اور عقل استعمال کر کے اس سے اپنے لئے سبق نکالنے ہیں۔ اسی لئے اللہ کہتا ہے قرآن میں' کہ یہ نصیحت ہے عقل والوں کے لئے۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں زمر' کہ اگر ہر شخص یوں تدبر کرنے لگے گا' بھلے وہ اس کی اپنی رائے نہ ہو' بھلے وہ آیت کے اندر رہ کر ہی کہے یہ سب... تب بھی... کیا فتنہ نہیں کھڑا ہوگا؟ کیونکہ بہت سے لوگ غلط تدبر نہیں کرنے لگ جائیں گے اور دوسروں کو بھٹکائیں گے؟"

حنین اب فرنچ فرائز ساس میں ڈپ کر کر کے کھاتی پوچھ رہی تھی۔ (بڑے ماموں... آپ کی وجہ سے کل سے کھانا نہیں کھایا۔)

"کیا مطلب کہ لوگ غلط تدبر کریں گے؟ لوگ پہلے ہی غلط تدبر کر رہے ہیں' حنین۔ اسی قرآن کی آیات کو استعمال کر کے دہشت گرد بے گناہ لوگوں کو قتل کرتے ہیں۔ قادیانی اسی قرآن سے اپنے مطالب نکالتے ہیں۔ سلمان رشدی جیسے لوگ اسی قرآن کو کوٹ کر کے اپنی کتابیں لکھتے ہیں۔ مسلمانوں میں ہی لوگ "دین میں کوئی جبر نہیں" جیسی آیات کا معانی بدل کر اسے استعمال کرتے ہیں۔ لوگ تو ہمیشہ سے یہ کام کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ ایسے میں تو ہمیں زیادہ ضرورت ہے قرآن میں صحیح تدبر کرنے کی تاکہ ہم روشنی پھیلائیں اور اس سے غلط تدبر کرنے والوں کے اندھیرے کو مٹائیں۔ لوگوں کو قرآن کا اصل مطلب بتائیں۔"

''وہی تو زمر... اگر ہم بھی تدبر کو فروغ دیں گے تو یوں لوگوں کے غلط تدبر کا رسک بڑھے گا۔ پہلے جہاں بیس لوگ قرآن کو غلط بیان کرتے تھے وہاں اب سو لوگ ایسے کرنے لگ جائیں گے۔''

''ہاں تو کرتے رہیں۔'' اس نے شانے اچکائے تھے۔

''کرتے رہیں؟'' حنین کا کانٹا پکڑے ہاتھ فضا میں معلق ہو گیا۔ منہ کھل گیا۔ ''کرتے رہیں؟''

زمر نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''ہاں کرتے رہیں، مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کیونکہ یہ قرآن ہے۔ ڈیئر حنین، اور اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے۔ جو اس میں غلط تدبر کرے گا، اس میں معنوی تحریف کرے گا، وہ خود ہی رسوا ہو کر کسی کونے میں پڑا ہو گا۔ اللہ فرماتا ہے، ہر چیز سمندر کی جھاگ کی طرح ہے، بہہ جائے گی، لیکن جو لوگوں کو نفع دیتا ہے، صرف وہی رہ جائے گا۔ تو جو صحیح تدبر کرے گا، اس کا کام رہ جائے گا۔ باقی سب سمندر کی جھاگ کی طرح بہہ جائے گا۔ کتنے عرب شعراء نے قرآن کی طرح کلام لکھنے کی کوشش کی، کہاں ہے ان کا کام؟ کہاں ہے سلمان رشدی کی کتاب؟ پتہ ہے کیا، جب امام مالک موطا لکھ رہے تھے (حدیث کی ایک مستند کتاب) تو بہت سے لوگوں نے اپنی اپنی کتب کا نام موطا رکھ کر لکھنا شروع کر دیا تو کسی نے امام مالک سے کہا کہ آپ اپنی کتاب کا نام بدل دیں تو انہوں نے فرمایا ''جو اللہ کے لئے ہے وہ رہ جائے گا۔'' آج صرف ایک موطا مارکیٹ میں ملتی ہے جو امام مالک کی ہے۔ باقی کہاں گئیں؟ تو قرآن کی بقا کے لئے ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کو کوئی نقصان نہیں دے سکتا۔ اس نے خود ہمیں دعوت دی ہے کہ ہم اس کے اندر تدبر کریں اور اس کے ساتھ لوگوں کو نصیحت کریں۔ ہم اچھی نیت سے، اور اس کو سمجھ کر اس کا مطلب بیان کریں گے، اور اس سے اپنے لئے اسباق نکالیں گے تو ہمارا کام رہ جائے گا، لیکن جہاں ہم غلط کچھ کہیں گے یا لکھیں گے تو ہم خود ہی مٹ جائیں گے۔''

''رائٹ!'' حنین بھی گویا چونک سی گئی تھی۔ اس نہج پہ اس نے پہلے نہیں سوچا تھا۔ زمر نے پلیٹ میں اسٹیک نکالتے ہوئے اسی اعتماد سے حنہ کو مخاطب کیا۔

''اور تم مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ فرعون بنی اسرائیل کے بیٹوں کو مارتا تھا اور عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا، اس میں اور کس طرف اشارہ ہو سکتا ہے؟ تو اگر تم اس آیت کے الفاظ پہ غور کرو تو ''بیٹوں'' کو مارتے تھے اور ''عورتوں'' کو زندہ چھوڑتے تھے کہا گیا ہے۔ ''بیٹوں'' کے مقابلے پہ ''بیٹیاں'' کہا جانا چاہیے، مگر نہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''عورتیں''۔'' اب کے اس نے بھی اپنی پلیٹ میں اسٹیک نکالی اور اسی روانی میں بولتی گئی۔ ''فرعون کو جب معلوم ہوا کہ ایک بنی اسرائیلی لڑکا اس کے زوال کا سبب بنے گا تو اس نے پتہ کروایا کہ وہ کس سال میں پیدا ہو گا۔ ان کے اپنے حساب تھے۔ ایک سال میں پیدا ہونے والے بچے وہ مروا تا تھا، اگلے سال والے چھوڑ دیتا تھا۔ جس سال ہارون علیہ السلام پیدا ہوئے اس سال بچے نہیں مارنے تھے، سو ان کو چھوڑ دیا گیا۔ مگر جس سال موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اس سال بچے قتل کیے جا رہے تھے۔ تو ہاں، ایک طرف یہ آیت بنی اسرائیل کی بے بسی اور ذلت کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ وہ ان کے بیٹوں کو مارتا تھا، مگر ''عورتوں'' کو چھوڑ

دیتا تھا۔ بیٹیوں کو نہیں' عورتوں کو۔ ماں بھی' بہن بھی۔ چاہے کوئی بھی اسرائیلی عورت ہو' فرعون نے اسے چھوڑ دیا۔ اور پھر انہی دو عورتوں نے ...موسیٰ کی والدہ اور ان کی بہن...انہی نے تدبیر کی...نہ صرف موسیٰ کی جان بچائی بلکہ ان کا فرعون کے محل میں رہنا سہل بھی بنایا۔ اگر موسیٰ کی والدہ اللہ کے حکم کو اس وقت نہ مانتیں' اور تدبیر نہ کرتیں تو فرعون کا زوال کیسے ہوتا؟ سو مجھے لگتا ہے اس آیت میں فرعون کی غلطی کی طرف بھی اشارہ ہے۔ فرعونین غلطی کرتے ہیں جب وہ کسی قوم کی عورتوں کو کمزور اور کم عقل جان کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اور سارا فوکس ان کے مردوں پر رکھتے ہیں۔"

اور زمر یوسف کو لگا' یہ سب کہہ کر' خود اس کے دل کو سخت پتھر بنائے خول میں دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ سنا تھا قرآن دلوں کو نرم کرتا ہے' آج لگا تھا' واقعی کرتا ہے۔ ہلکی پھلکی سی ہو کر وہ اب کھانا شروع کرنے لگی۔

"بالکل۔ عورتیں بہت کچھ کر سکتی ہیں' لیکن اگر وہ اکٹھی ہوں۔"

حنین نے مسکرا کر زمر کو دیکھا۔ "بہت سالوں بعد آپ کے منہ سے قرآن کی باتیں سنیں۔ اچھا لگا۔ کبھی آپ بھی لکھا کریں نا یہ سب سعدی بھائی کے فیس بک گروپ پہ۔" زمر کے چہرے پہ سایہ لہرایا۔

"جو لوگ اپنی ذاتی عبادات میں اچھے نہیں ہوتے' ان کو کوئی حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ دین کا کام کریں۔ میں بے روح عبادت کے بعد کیسے لوگوں کے سامنے قرآن کو بیان کر سکتی ہوں؟ یہ کام سعدی جیسوں کے لئے ہی سجی ہے۔" وہ خاموشی سے سوچتی رہی' بولی نہیں۔ حنہ اب سارا غم' بھلائے کھانا کھا رہی تھی۔ (کاش کسی دن وہ کسی بیکری میں بند ہو جائے اور سب کچھ چٹ کر جائے....) وہ بچپن کی معصوم خواہش آج پھر دل کو گدگدانے لگی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ملنے کو زندگی میں کئی ہمسفر ملے
لیکن طبیعتوں سے طبیعت نہیں ملی

ہاکر 400 فضا میں تیر رہا تھا اور نیچے پھیلی دنیا کی سردی کے برعکس اس کے اندر کا ماحول گرم اور آرام دہ تھا۔ چھوٹی چوکور کھڑکی سے باہر دیکھتے فارس کی آنکھوں میں گہری سوچ تھی۔ ابرو ذرا اکٹھے کیے ہوئے تھے اور سر پہ سیاہ پی کیپ پہن رکھی تھی۔

اس کے مقابل نشست پہ آبی بیٹھی تھی۔ اس نے سرخ ریشمی رومال سر پہ باندھ کر گردن کے پیچھے گرہ لگا رکھی تھی اور رومال سے نکلتی بھوری سرخ چوٹی بائیں شانے پہ آگے کو ڈال رکھی تھی۔ وہ ہتھیلی پہ چہرہ جمائے' سرخ لب کاٹتی' سرمئی آنکھیں فارس پہ مرکوز کیے ہوئے تھی۔ اس کے چہرے پہ معصومیت اور خوشی دونوں تھیں۔ ملازم ٹرے لئے اس کے پاس آ کر کھنکھارا تو وہ چونکی' گردن اٹھا کر اسے دیکھا اور "تھینک یو آفتاب" کہتے ہوئے گلاس اٹھا لیا۔ ملازم فارس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے' گردن موڑے بنا "تھینکس" کہا۔ آبی نے ہاتھ کے اشارے سے آفتاب کو جانے کا کہا۔ وہ ایک خاموش نظر فارس پہ ڈال کر مڑ گیا۔

وہ دونوں تنہا رہ گئے تو آبدار کھنکھاری۔ ’’کیپ اتار دیں۔ میری ملازم کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔‘‘

فارس نے سنجیدہ چہرہ اس کی طرف موڑا۔

’’اس نے تین دفعہ مجھے سر سے پیر تک دیکھا ہے۔ وہ ذہن میں میری پروفائلنگ کر رہا تھا۔ لینڈ کرتے ہی وہ آپ کے والد کو کال کرے گا اور ان کے سامنے مجھے پروفائل کرے گا۔‘‘

’’نہیں‘ وہ قابل بھروسہ آدمی ہے‘ آپ فکر مت کریں‘ وہ....‘‘

’’مجھے بالکل فکر نہیں ہے‘ آبدار۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ آپ کے والد کو بتائے۔‘‘ وہ بے تاثر نظروں سے اس کو دیکھ کر بولا تھا۔

آبدار کی آنکھیں اس پہ ساکت سی ہو گئیں۔ ’’جی؟‘‘

’’میں اپنے کام خود کرتا ہوں‘ لیکن جب کوئی کام بساط سے بڑھ کر لگے تو اس کا بوجھ بانٹ دیتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہاشم جانے‘ میں کولمبو جا رہا ہوں۔ اس کے لئے جو کر سکتا تھا‘ وہ کیا۔ لیکن قوی امکان ہے کہ کوئی مجھے دیکھ لے اور ہاشم کو بتا دے۔ سو میں نے آپ کے ساتھ جانے کو ترجیح دی‘ کیونکہ آپ کا عملہ ضرور آپ کے والد کو بتائے گا اور میرے حصے کا آدھا کام وہ کریں گے۔‘‘

’’اور آپ کو کیوں لگتا ہے کہ بابا ہاشم سے اس بات کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں گے؟‘‘

’’کیونکہ آپ میرے ساتھ ہیں۔ وہ آپ کو دو دشمنوں کی فائر لائن کے درمیان نہیں کھڑا کرنا چاہیں گے۔‘‘ وہ ہلکا سا مسکرایا۔ کیپ نے اس کی آنکھوں پہ اندھیرا سا کیا ہوا تھا۔

’’یعنی....‘‘ آبی متحیر رہ گئی۔ ’’آپ مجھے استعمال کر رہے ہیں۔‘‘

’’جی میں آپ کو استعمال کر رہا ہوں۔‘‘ وہ کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

آبی کو پھر بھی برا نہیں لگا۔ کہنی سیٹ کے ہتھے پہ جمائے‘ ہتھیلی پہ چہرہ گرائے اس کو دیکھتے ہوئے سوچ کر کہنے لگی۔ ’’میرا خیال تھا ہم دوستوں کی طرح ساتھ جا رہے ہیں۔‘‘

’’ہم دوست نہیں ہیں آبدار۔‘‘

’’آپ مجھے آبی کہہ سکتے ہیں۔‘‘

’’اوکے!‘‘ فارس نے سر کو خم دیا اور بات دہرائی۔ ’’ہم دوست نہیں ہیں مس عبید۔‘‘

’’میں آپ کے ذاتی مسئلے میں آپ کی مدد کر رہی ہوں‘ پھر بھی ہم...‘‘

’’یہ ’’ذاتی‘‘ نہیں ہے میرے لئے۔‘‘ اس نے سنجیدگی سے چہرہ آبدار کی طرف موڑا۔ ’’یہ میرے لئے ’’کام‘‘ ہے۔ مجھے کچھ کام کرنے ہیں واپس جانے سے پہلے اور....‘‘ وہ رک گیا۔

’’کدھر واپس جانے سے پہلے؟‘‘ وہ چونکی۔ چہرہ ہتھیلی سے اٹھایا اور سیدھی ہو کر بیٹھی۔ فارس چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

''جیل واپس جانے سے پہلے۔''

آبی دھک سے رہ گئی۔ ''آپ دوبارہ جیل کیوں جائیں گے؟'' فارس نے کافی دیر جواب نہیں دیا' لیکن جب وہ اسی طرح اسے دیکھتی رہی تو وہ قدرے نرمی سے بتانے لگا۔

''جب چار سال کی قید کاٹ کر نکلا تھا تو میرے پاس ایک پلان تھا' سب اسی کے مطابق کر رہا ہوں۔ یہ میرا ''کام'' ہے۔ ''ورک'' ہے۔ ''پرسنل'' نہیں ہے۔ اور اس کا انجام ایک ہی طرح سے ہوگا۔ مجھے واپس جیل جانا ہے' ان جرائم کے لئے جو میں نے ابھی کرنے ہیں۔ مگر اس سے پہلے' مجھے اپنی فیملی کو محفوظ کرنا ہے' اور سعدی کو واپس لانا ہے۔''

آبدار چند لمحے کچھ بول ہی نہ سکی۔ ''پھر ''ذاتی'' کیا ہے آپ کے لئے؟ کیا آپ اپنے لئے نہیں جیتے؟''

''میری ایک بیوی ہے' جس سے میں جھوٹ بول کر آیا ہوں' میری ایک بھانجی ہے جس سے میں بات کیے بنا آیا ہوں۔ میرا ایک دوست ہے جس سے لڑا ہوں میں کل رات۔ مگر ذاتیات میں آپ سے ڈسکس نہیں کرنا چاہتا' اس لئے ہم اس طرف نہیں جائیں گے۔'' اس نے حد بندی واضح کی۔ آبی بس اس کو دیکھ کر رہ گئی۔

''اسی لیے مسز زمر اور آپ کی ڈائیورس ہونے جا رہی ہے۔ (فارس نے چونک کر اسے دیکھا) آپ آخر میں جیل جانا چاہتے ہیں' اس لئے ان کو آزاد کر دیں گے۔ حیران مت ہوں' مجھے مسز کاردار نے بتایا تھا۔''

فارس نے خاموشی سے سر کو اثبات میں خم دیا۔

''کون سا جرم ہے جو آپ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ذاتی تو نہیں ہے' ''ورک'' ہے نا' اس لئے بتا دیں۔''

جہاز کے اندر ایک دم ڈھیر سارا سناٹا اتر آیا۔

''میں نے دو قتل کرنے ہیں۔''

آبی کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر اترتی محسوس ہوئی۔

''تو ابھی تک کیے کیوں نہیں؟''

''پہلے ان کو تقسیم کرنا ہے' پھر توڑنا ہے' پھر مارنا ہے۔ یہ شروع دن سے میرا ہدف تھا۔'' اس کی آواز ہلکی تھی۔

''اور پھر آپ گرفتاری دے دیں گے؟'' اس نے اداسی سے پوچھا۔ ''لیکن اس کے علاوہ بھی تو کوئی راستہ ہو سکتا ہے۔ آپ ملک سے باہر بھاگ سکتے ہیں نا اور....''

''اپنے جرائم کی سزا بھگتنا چاہتا ہوں میں۔ فرار نہیں چاہتا ان سے۔''

آبدار نے گہری سانس لی۔ ''تو میں آپ کی کیا ہوں؟ دوست نہیں ہوں تو کیا پارٹنر ان کرائم ہوں؟''

اس بات پہ وہ مسکرایا۔ جیسے کسی کو یاد کر کے مسکرایا ہو۔ ''میری پارٹنر ان کرائم ایک ہی ہے' اس کی جگہ میں کسی کو نہیں دے سکتا۔''

''مگر اس سے جھوٹ بول کر آئے ہیں اور اس کے ساتھ اپنے پلان کا انجام بھی ڈسکس نہیں کیا آپ نے۔ سو وہ آپ کی بیوی ہو سکتی ہے 'آپ کی پارٹنر ہو سکتی ہے' لیکن.....'' آبی کی سرمئی آنکھوں میں شرارت چمکی۔ وہ آگے کو ہوئی' اور مسکرا کر اسی فاتحانہ انداز میں بولی۔ ''آپ کو ماننا پڑے گا کہ آپ کی ورک وائف آبدار عبید ہی ہے۔''

اس بات پہ وہ ہلکا سا ہنس دیا اور پھر سر کو اثبات میں دو تین دفعہ ہلایا۔ ''او کے۔ آپ میری ورک وائف ہیں۔''

''جسے آپ استعمال کر رہے ہیں۔'' مصنوعی خفگی سے اس نے گلہ کیا۔

''بالکل' کیونکہ میں بدلے میں آپ کو کچھ دوں گا' جو کبھی آپ لوگوں کو ہپناٹائز کر کے ڈھونڈتی ہیں' کبھی فرانزک والوں کے ساتھ کام کر کے مجرموں کے انٹرویوز کر کے تلاش کرتی ہیں۔ کبھی وہ چیز آپ جانوروں اور پرندوں کی فوج جمع کر کے حاصل کرنا چاہتی ہیں' کبھی لوگوں کے NDE سن کر۔''

آبدار نے حیرت بھری دلچسپی سے اسے دیکھا۔ ''اور وہ کیا ہے جو آپ مجھے دیں گے؟''

فارس نے ذرا سا مسکرا کر ابرو اچکائے۔ ''ایک دلچسپ ایڈوانچر!''

آبدار کا دورانِ خون ایک دم تیزی سے بڑھا اس کے گال دہک گئے اور آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''پھر ٹھیک ہے!'' وہ بہت محظوظ ہوئی تھی۔

فارس پھر سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگ گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تو بھی کسی کے باب میں عہد شکن ہے غالباً
میں نے بھی ایک شخص کا قرض ادا نہیں کیا

فوڈلی ایور آفٹر کے بالائی ہال میں سورج کی روشنی کھڑکیوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ زمر کونے والی میز پہ موٹی کتاب رکھے اس میں سے نوٹس بنا رہی تھی۔ گاہے بگاہے موبائل پہ نظر ڈالتی جو صبح فارس کے جانے کے بعد سے ابھی تک اس کے نام سے روشن نہیں ہوا تھا۔ (کیا آدمی گھر اطلاع نہیں دے سکتا؟ یہ کیا کہ ایک میسج کر دیا پہنچنے کا۔ وہ بھی فیس بک پہ۔ کال نہیں کر سکتا تھا کیا؟) وہ سر جھٹک کر کام کرنے لگی' پھر ایک دم مڑ ور سے قلم بند کیا اور فون اٹھا لیا۔ (ڈاکٹر کے ساتھ کیا بات ہوئی' تفصیل ہی نہیں بتائی۔ وہی پوچھ لوں۔) جواز گھڑ کر اس نے کال ملائی۔ گھنٹی جانے لگی' مگر.....جواب ندارد۔

اکتا کر اس نے فون پرے ڈال دیا۔ تبھی کسی نے دروازہ ہلکا سا کھٹکھٹایا۔ زمر نے مصروف سے انداز میں سر اٹھایا مگر ایک دم ٹھہر گئی۔

چوکھٹ میں نوشیرواں کھڑا تھا۔ ویسٹ اور ٹائی میں ملبوس' بالکل تیار سا' وہ متذبذب لگ رہا تھا۔

''آیئے.....'' زمر نے استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے کہا تو وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا سامنے آیا اور کرسی کھینچ کر بیٹھا۔

''کیسی ہیں آپ ڈی اے؟''

زمر نے کہنیاں میز پہ جمائے، سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"میں ڈی اے نہیں تھی، ڈی پی تھی۔ مجھے امریکی فلموں کے سے انداز میں مخاطب..." ضبط سے گہری سانس لی۔ "کر سکتے ہیں آپ۔ خیر کہیے۔ کیسے آنا ہوا؟"

شیرو اپنی فرنچ کو دو ناخنوں سے کھجاتے، نگاہیں اس پہ جمائے، سوچ سوچ کر کہنے لگا۔

"ایک مشورہ چاہیے تھا۔ لیگل ایڈوائس۔"

"میں سن رہی ہوں۔"

"مجھے... کسی بہت اچھے اور با اعتماد وکیل کا بتائیں جو کارپوریٹ کیسز اچھے سے ڈیل کر سکے۔"

"ہاشم کاردار!" وہ سہولت سے بولی۔

نوشیرواں کی آنکھوں میں بے چینی اور ناگواری ایک ساتھ ابھریں۔ "کوئی اور...."

زمر نے "اوہ" والے انداز میں ابرو اٹھائے۔ "یعنی آپ اس معاملے کو ہاشم سے خفیہ رکھنا چاہتے ہیں۔"

"ان سے خفیہ کیوں رکھوں گا، وہ میرے بھائی ہیں بس ان کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا۔" اس نے پہلو بدلا۔ انداز دفاعی تھا۔

"او کے۔" زمر نے نوٹ پیڈ اٹھایا اور چند نام لکھنے لگی۔ "یہ بیس افراد ہیں، مگر یہ آپ کا فون رکھتے ہی ہاشم کو کال کر کے بتائیں گے۔ آپ کو کوئی ایسا ماہر وکیل نہیں ملے گا جس کو میں جانتی ہوں اور جو ہاشم کو نہ بتائے۔"

"کیا آپ بھی ہاشم کو بتائیں گی؟"

زمر نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور پھر قلم بند کر دیا۔ "آپ کو کس قسم کا کام ہے نوشیرواں؟"

"میں اپنی کمپنی میں پچاس فیصد شیئرز کا مالک ہوں۔ 25 ہاشم بھائی کے اور 25 ہارون انکل کے ہیں۔ میں چاہتا ہوں وہ باقی کے پچاس بھی میرے پاس آ جائیں۔ اگر میرا وکیل کوئی ایسا چکر چلائے اور کمپنی کے بائی لاز کے دو چار جھول تو میرے بھی ذہن میں ہیں، اور..."

"آپ ہاشم کو سزا دینا چاہتے ہیں؟" نوشیرواں ٹھہر گیا۔ زمر پہ نگاہیں جمائے اس نے تھوک نگلی۔ آنکھوں میں بہت سے جذبات ابھر کر ڈوبے۔ مگر خاموش رہا۔

"آپ کسی بات پہ ہاشم سے ناراض ہیں، اور اس کو سزا دینا چاہتے ہیں۔" وہ ٹیک لگا کر بیٹھی، قلم انگلیوں میں گھماتی، اسے دیکھ کر سوچتے ہوئے بول رہی تھی۔ شیرو چپ رہا۔

"آپ کو یہ نہیں کرنا چاہیے۔ جس بھی طریقے سے 50 فیصد شیئرز لے لیں آپ، ہاشم اگلے ہی دن اس کاغذ کو بھک سے اڑا دے گا۔ شیئرز حاصل کر کے آپ کو کیا ملے گا؟ پیسے کے لیے تو آپ یہ نہیں کر رہے۔ اندرونی تسکین کے لیے کر رہے ہیں۔ تو یہ نہیں کرنا چاہیے آپ کو۔ بلکہ اس کی بجائے... آپ وہ کریں جو ہاشم نہیں چاہتا۔ مگر وہ کچھ نہ کر سکے۔ آپ شیئرز "لینے" کی بجائے شیئرز "دے" دیں۔"

نوشیرواں کی آنکھوں میں الجھنا ابھرا۔ وہ ذرا آگے کو ہوا۔

''کدھر دے دوں؟''

زمر نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ ''فری کنسلٹیشن کے پانچ منٹ گزر چکے ہیں۔ اب میں اگلی بات صرف اس صورت میں بتا سکتی ہوں جب آپ مجھے ہائر کریں۔ سو.... آپ مجھے ہائر کر رہے ہیں یا نہیں؟'' نرمی سے اس نے پوچھا۔ نوشیرواں کی آنکھیں چمکیں اور وہ پہلی دفعہ مسکرایا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ عجب قیامتیں ہیں تیری رہگزر میں گزراں
نہ ہوا کہ مر مٹیں ہم نہ ہوا کہ جی اٹھیں ہم

ائیر پورٹ کے احاطے سے باہر نکلتے ہی آبدار نے ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھایا تھا۔

''یہ میرے اپارٹمنٹ کی چابی ہے۔ ہمارے ہوٹل سے کافی دور ہے۔ اس کے اندر اس کا ایڈریس اور چابیاں موجود ہیں۔ آپ جب تک چاہیں ادھر رہ سکتے ہیں۔''

فارس نے کیپ ماتھے پہ مزید ترچھی کر کے جھکاتے وہ پیکٹ پکڑا۔

''اور کیوں لوں گا میں آپ کا فلیٹ؟''

''کیونکہ آپ مجھے استعمال کر رہے ہیں۔'' وہ شرارت سے مسکرائی۔ فارس نے بے اختیار مسکراہٹ دبائی اور سر کو خم دیا۔ ''سو تو ہے۔ جاتے وقت واپس کر جاؤں گا۔'' اور پیکٹ جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

''ہم دوبارہ ملیں گے فارس غازی!'' وہ چیلنج کرنے والے انداز میں کہہ کر مڑ گئی۔ اس کی کار دور سڑک پہ آ رکی تھی۔

وہ وہاں سے سیدھا آبدار کے فلیٹ آیا تھا۔ پوش علاقے میں واقع ایک خوبصورت عمارت میں بنا وہ فلیٹ اندر سے بھی بہت خوبصورت تھا۔ چکنی چکنی سفید دیواریں' نرم رنگوں کے پردے' قیمتی مگر ماڈرن فرنیچر۔ وہ بنا آرام کیے' سب سے پہلے لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھا اور اپنے جی پی ایس چپ کا سگنل چیک کیا۔ وہ ابھی تک اس پارک میں تھا۔ فارس نے راستے سے خرید انقشہ نکالا اور اسے پھیلا کر سامنے رکھا۔ وہ پارک یہاں سے پچاس منٹ کی ڈرائیو پہ تھا۔ وہ نقشے پہ مختلف نکات پہ نشان لگاتا' آگے کا لائحہ عمل تیار کرتا رہا۔ وہ مصروف ہو گیا تھا۔ زمر یا گھر والوں کو کال کرنا اس کے ذہن سے نکل گیا تھا۔ یاد تھا تو صرف سعدی۔

نوشیرواں کو ''رخصت'' کر کے زمر نیچے آئی تو ریسٹورانٹ کے باہر پھولوں والا لڑکا گل خان بیٹھا تھا۔ اپنے پھولوں کے اسٹال پہ پانی کا چھڑکاؤ کرتا وہ مصروف نظر آ رہا تھا۔

''وعلیکم السلام گل خان!'' نرم ٹھنڈے انداز میں پکارا تو وہ چونکا' اسے دیکھا اور شرما کر مسکراتے ہوئے سلام کیا۔ پھر جلدی سے بولا۔

''باجی یہ جولڑکا ابھی یہاں سے نکلا تھا' یہ وہی تھا' سفید گاڑی والا جس کا سعدی بھائی سے....'' گل خان نے مزید سراغرسانی کے جوہر دکھانے چاہے مگر زمر نے ''مجھے پتہ ہے'' کہہ کر بات ختم کردی۔ (ہاشم نے سعدی کو گولیاں مروادیں' یہ معلوم ہوجانے کے بعد یہ سوچنا کہ شیرو کا اس سے زبانی کلامی کبھی کوئی جھگڑا ہوا تھا بے معنی سا لگتا تھا۔)

وہ گھر آئی تو لاؤنج میں معمول کی چہل پہل لگی تھی۔ اس گھر کا لاؤنج کافی کھلا اور بڑا تھا۔ کچن یہاں سے نہیں دکھائی دیتا تھا۔ بغلی گیلری میں آگے بڑھتے تو پھر آتا تھا۔ لاؤنج کے ایک طرف ڈائننگ ہال تھا۔ دونوں کے درمیان میں شیشے کے سلائیڈنگ دروازے تھے۔ (ان کے پردے ابھی بنوانے تھے۔) بڑی ایل ای ڈی اسکرین دیوار پہ نصب تھی اور ندرت صوفے پہ بیٹھیں' عینک لگائے' موبائل کو دیکھ کر حنین کو پکار رہی تھیں۔

''حنین' ذرا میرا جی میل تو دیکھو' بار بار تنگ کر رہا ہے۔'' مگر نقار خانے میں امی کی کون سنتا ہے؟ حنہ ڈائننگ روم میں کرسی پہ بیٹھی' لیپ ٹاپ میز پہ رکھے کھٹ کھٹ کام کیے جا رہی تھی۔

''زمر فارس نے پہنچ کر اطلاع دی؟'' اباجان نے اسے پکارا تو اس نے نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ ''جی'' کہہ کر ان کی تسلی کرادی۔

''اس سے کہنا ویک اینڈ پہ گھر آجائے۔ مگر بار بار فلائٹس کا خرچہ... اونہوں۔'' ندرت نے اپنی ہی بات کی خود ہی تردید کردی۔

زمر حنہ کے پاس آگئی اور شیشے کا دروازہ بند کردیا۔ پھر اس کے ساتھ کرسی پہ بیٹھی اور پوری ہو کر اسے دیکھا۔

''کیا کر رہی ہو؟'' حنین کو جیسے کسی سامع کی تلاش تھی۔ جوش سے شروع ہوگئی۔

''اس فلیش میں فروزن کے سوا کچھ نہیں ہے' مگر یاد ہے' سونیا کی سالگرہ کا کیک؟'' اس نے پچھلے سال کی سیاہ سنہری سالگرہ یاد دلائی۔

''باربی کیک تھا۔ پنک باربی۔''

جواباً حنہ نے اسکرین پہ چند تصاویر نکالیں۔ سونی کی سالگرہ کی تصاویر۔

''یہ باربی لگتی ہے' مگر یہ باربی نہیں ہے۔ اس کی شکل غور سے دیکھیں۔ یہ آنا Anna ہے۔ پرنسس آنا۔ سونی کو فروزن پسند ہے۔''

''تمہیں کیسے پتہ؟''

''زمر کون سا بچہ ہے جس کو فروزن نہیں پسند؟ مگر سونی اپنے باپ کی طرح (دل میں کچھ چھپا) بہت انا والی ہے۔ وہ کھلم کھلا یہ ظاہر نہیں کرسکتی کہ وہ بھیڑ چال کا حصہ بن کر عام لوگوں کی طرح کسی فلم کی دیوانی ہے۔ وہ مختلف ہے۔ اس نے آنا اور باربی کو مکس کر کے ایک نئی ڈول بنائی۔ یہ بات ہم نے نہیں نوٹس کی تھی' مگر سونی کے دوست بچوں نے نوٹس کی ہوگی اور اسکی واہ واہ ہوئی ہوگی۔'' وہ جوش سے بتا رہی تھی۔

''فلیش' حنہ!'' زمر نے یاد دلایا۔

''ہاں وہی۔ اس فلیش میں صرف فروزن ہے۔ یہ فلیش ہاشم کے ڈیٹا سے بھری ہونی چاہیے تھی۔ ہے نا؟ مگر فلیش کو خالی دیکھ کر میں سمجھی یہ غلط فلیش ہے۔ جبکہ ایسا نہیں ہے۔ اس میں ہاشم کا ہی ڈیٹا تھا۔ فروزن بھی اسی کے ڈیٹا میں ہوگی' سونی نے ڈاؤن لوڈ کی ہوگی نا۔ اس

فلیش میں زمر، ہاشم کی ساری فائلز موجود تھیں مگر کسی نے فروزن کے سوا سب کچھ مٹا دیا۔"

"مگر کس نے!" زمر چونکی تھی۔

"یہ تو سعدی بھائی ہی بتا سکتا تھا۔" اس نے گہری آہ بھری۔ یہ ایسا ذکر تھا جس پہ دونوں خاموش ہو گئیں۔ باہر سے امی کی پکار پھر سے شروع ہو گئی۔ "حنہ... میرا میل باکس فل ہو رہا ہے۔"

"ایک تو امیوں کو اسمارٹ فون نہ لے کر دے بندہ۔ مصیبت میں اولاد آ جاتی ہے۔" جل کر بولی۔ پھر چہرہ اونچا کر کے آواز لگائی۔ "میں بزی ہوں امی۔ رات میں دیکھ دوں گی۔" پھر وہ زمر کی طرف گھومی اور چمکتی آنکھوں کے ساتھ اعلان کیا۔ "مجھے وہ فائلز چاہیے ہیں۔ میں ہاشم کے کمپیوٹر کو ہیک کرنے لگی ہوں۔ اور مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔" زمر خاموش رہی۔ وہ اس کے ساتھ تھی۔ خاور نہیں تھا۔ اب ڈر کیسا؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اچھی لگتی نہیں اس وجہ شناسائی

ہاتھ ہاتھوں سے ملاتے ہوئے تھک جاتا ہوں

کولمبو پہ شام نیلی اور بھیگی بھیگی سے سائے پھیلانے لگی۔ ایسے میں اس بلند بالا عمارت سے فارس نکلتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بھورے سوئیٹر اور نیلی جینز میں ملبوس، جیبوں میں ہاتھ ڈالے، وہ سنجیدہ سی سنہری آنکھوں سے سامنے دیکھتا، چلتا جا رہا تھا جب قریبی کیفے کا گلاس ڈور کھلا اور اندر سے آبدار نکلتی دکھائی دی۔ نیلی جینز پہ سفید گھٹنوں تک آتا کوٹ پہنے اس کے سیدھے سرخ بال کمر پہ گر رہے تھے اور سر کے اوپر سرخ ریشمی رومال باندھ کر گردن کے پیچھے گرہ لگا رکھی تھی۔ سرمئی آنکھوں میں چمک لیے، وہ شرارت سے سرخ لب کاٹتی دوڑتی ہوئی آئی اور اس کے ساتھ آملی۔ فارس رک گیا اور قدرے خفگی سے اسے دیکھا۔

"آپ ادھر کیا کر رہی ہیں مس آبدار؟"

"آپ کو اپنے ذہن میں آئی باتیں شیئر کرنے کے لیے کسی کی ضرورت تو ہو گی۔" اس نے چہک کر ورک وائف کا مقصد یاد دلایا۔

"میں اکیلا زیادہ آرام دہ رہتا ہوں۔"

"مگر زیادہ خوش نہیں۔" فارس نے قدرے برہمی سے سر جھٹکا اور تیز تیز چلنے لگا۔

"تھینک یو، میرا دل رکھنے کے لیے۔" وہ اب ہنستی مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ فٹ پاتھ پہ چلتی جا رہی تھی، قریب سے گزرتے بچے کے ماتھے پہ ہاتھ پھیر کر اس کے بال بکھیرے۔ پھر ذرا آگے ایک ننھی بچی کی پونی پیچھے سے کھینچی اور اس سے پہلے کہ وہ مڑتی، آبی جلدی سے آگے نکل گئی۔

"آپ کو بچے اچھے لگتے ہیں، فارس؟" وہ پیچھے مڑ مڑ کر ایک شرارتی نظر اس بچی پہ ڈال کر کہہ رہی تھی۔ فارس نے ایک دم رک کر اس کو دیکھا۔ وہ بظاہر مگن سی کہہ رہی تھی۔

''آپ کا اپنی فیملی کے لیے دل نہیں چاہتا کیا؟ مگر...اوہ...مسز زمر تو...خیر....'' آبی نے سادگی اور معصومیت سے شانے اچکائے اور ایک کیب کو رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا جیسے اس کی بات کو سوچنے لگا ہو۔

''جب آپ کو معلوم ہے کہ میں اور مسز زمر الگ ہو جائیں گے تو ایسی بات کا مقصد؟''

''ان سے الگ ہونے کے بعد آپ کی زندگی ختم تو نہیں ہو جائے گی نا؟ کبھی تو آپ کو اپنی ذات کے لیے بھی کچھ سوچنا پڑے گا۔''

''آپ میرے ساتھ نہیں آ رہیں۔ واپس جائیے۔'' قدرے پست مگر ڈسٹرب آواز میں اسے ٹوکتا وہ رکی ہوئی کیب کی طرف بڑھا۔

کیب ڈرائیور اب گردن نکال کر اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ وہ آگے کو جھکا اور مطلوبہ پارک کا نام لیا۔ ڈرائیور نے ایک نظر سر سے پیر تک اسے دیکھا' اور پھر اثبات کا اشارہ کرتے ہوئے کرایہ بتایا۔

''اتنے پیسوں میں تو ہم پورا کولمبو گھوم لیں۔ فارز جان کر لوٹو نہیں۔'' آبی چمک کر کہتی آگے آئی۔ ''تمہارا میٹر دیکھ سکتی ہوں میں اور اسٹینڈرڈ کرایہ بھی معلوم ہے مجھے۔'' پھر معصومیت سے فارس کو دیکھا۔ ''اب بھی ساتھ نہیں لے کر جائیں گے کیا؟'' اور کیب کا دروازہ کھول لیا۔ وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔ وہ تو ہارون عبید اور ہاشم کاردار کو آمنے سامنے لانا چاہ رہا تھا مگر یہ اچھی بلا پیچھے پڑ گئی تھی۔

وہ پارک کافی بڑا اور خوبصورت تھا۔ وہاں غیر ملکی سیاحوں کی بہتات تھی۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے تو فارس نے موبائل نکال کر اسکرین دیکھی۔ پارک کے وسط میں چین کا سگنل آ رہا تھا۔

''اتنے بڑے پارک میں ہم کہاں ڈھونڈیں گے اس چین کو؟'' آبی کو مایوسی ہوئی۔ وہ خاموشی سے ادھر ادھر دیکھتا آگے بڑھتا آیا' یہاں تک کہ اس کے قدم رک گئے۔ سگنل کی جگہ اس کے اپنے فون سے قریباً چند میٹر دور تھی۔ اس نے آنکھوں کی پتلیاں سکوڑ کر سامنے دیکھا۔

سبزہ زار پہ.... چند میٹر دور ایک ٹکٹ کی کھڑکی تھی اور اندر ایک باوردی ملازم کھڑا لوگوں کو ٹکٹ دے رہا تھا۔

''وہ چین اس ٹکٹ کیبن میں ہے۔ آؤ۔'' وہ اسے اشارہ کرتا گھاس پہ آگے آیا۔

کیبن کے اندر کھڑا ملازم سر جھکائے' کمپیوٹر پہ ٹائپ کر رہا تھا۔ سامنے قطار لگی تھی۔ وہ دونوں بھی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ آبی اس کے آگے تھی اور وہ پیچھے تھا۔ ان کی باری آئی تو آبی اس سے سنہالی میں ٹکٹ کا پوچھنے لگی۔ فارس نے گردن ذرا اٹھا کر اندر جھانکا۔ شیشے کی دیوار سے اندر کا منظر واضح تھا۔ بڑی سی ڈسٹ بن میں فاسٹ فوڈ کے چند خالی ڈبے رکھے تھے۔ ٹکٹ کلرک کے جوتوں پہ سوکھا ہوا کیچڑ لگا تھا اور وہ جمائی روکتا کمپیوٹر پہ کچھ ٹائپ کیے جا رہا تھا۔ ساتھ ہی سنہری قلم کاؤنٹر پہ رکھا تھا۔ چین دیکھ کر آبی کی آنکھیں چمکیں۔ مگر....

''چلو۔ جلدی۔'' اس نے پیچھے سے آہستہ سے سرگوشی کی۔ آواز میں بے چینی تھی۔ آبی نے جلدی سے وہ ٹکٹ تھامے اور پھر متحیر' متعجب سی قطار سے نکلی۔

''پھینکو ان ٹکٹس کو اور یہاں سے نکلو۔'' وہ غیر محسوس انداز میں رفتار بڑھاتا کہہ رہا تھا۔

''مگر کیوں؟ وہ چین اس کے پاس تھا اس سے پوچھتو سہی کہ....''

''کوئی فائدہ نہیں۔ سعدی ادھر نہیں ہے۔'' وہ بمشکل اس کی رفتار کا ساتھ دے پا رہی تھی۔ جب وہ باہر آ گئے تو اس نے پھولی سانس کے ساتھ خفگی سے پوچھا۔

''وہ چین سامنے تھا' آپ نے....''

فارس اس کی طرف گھوما اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ ''پارک کی انٹری کے قریب جگہ کچی ہے' چند کھڈے ہیں' جہاں بارش کا پانی جمع ہو جاتا ہے۔ آخری دفعہ بارش کب ہوئی تھی؟ ماہ کامل کی رات سے اگلی صبح۔ سعدی کے بھاگنے سے اگلی صبح۔ اس صبح یہ ملازم یہاں آیا تھا۔ وہ کیچڑ کے پاس سے گزرا تھا' اب وہ کیچڑ سوکھ چکا ہے مگر اس کے جوتے اب بھی میلے ہیں۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ وہ دو دن سے گھر نہیں گیا۔ وہ صبح شام ادھر ہی بیٹھا رہتا ہے۔ کھانا کھانے بھی نہیں جاتا۔ فاسٹ فوڈ منگواتا ہے' وہی کھاتا ہے۔ ایک ٹکٹ کلرک فاسٹ فوڈ وہ بھی اتنا سارا کیسے افورڈ کر سکتا ہے؟ سوائے اس کے کہ کوئی اس کو کھانا پہنچا دیتا ہے' تاکہ وہ یہاں بیٹھا رہے اور اگر کوئی سعدی کے چین کی تلاش میں آئے تو وہ اس کو پکڑ لے۔''

''مگر ہو سکتا ہے سعدی نے اسے یہاں بٹھایا ہو۔''

''سعدی اس ملک میں پہلی دفعہ آیا ہے' رہائی کی اگلی صبح ہی اس کے اتنے کانٹیکٹس کیسے بن سکتے ہیں؟'' وہ نفی میں سر ہلاتا کہہ رہا تھا۔ ''کسی کے پاس سعدی کا چین ہے اور وہ اس میں موجود جی پی ایس ٹریسر سے واقف ہے' اس لئے وہ اس کو bait کی طرح لگا کر اس شخص کا انتظار کر رہا ہے جس نے اسے وہ چین بھیجا تھا۔''

''اوہ واؤ!'' وہ ایک دم چہکی' پھر شکل پہ مسکینیت طاری کی۔ ''کیا میں اتنے مزے کے ایڈونچر پہ تھوڑا خوش ہو سکتی ہوں؟''

''نہیں۔ آپ واپس جا رہی ہیں۔'' وہ سڑک پہ آگے آیا اور اس کے لئے ایک ٹک ٹک روکنے لگا۔

''مگر....'' وہ احتجاج کرنے لگی۔

''اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں بغیر بتائے آپ کا فلیٹ چھوڑ کر روپوش نہ ہو جاؤں تو خاموش رہیں۔''

وہ منہ بسورے کھڑی تھی۔ ٹک ٹک ساتھ آ کر رکا تو فارس نے اشارہ کیا۔

''اب جائیے۔'' پھر آواز میں نرمی پیدا کی۔ ''صبح ملیں گے۔''

اس بات پہ وہ ہلکا سا مسکرائی اور اندر بیٹھ گئی۔ پھر اسے ہاتھ ہلایا۔ ''صبح! پکا!''

''پکا۔'' اس کے انداز پہ وہ بمشکل مسکراہٹ روک پایا۔ چلو' جو بھی تھا۔ وہ ایک معصوم اور پیاری لڑکی تھی۔

وہ چلی گئی تو گویا ایک بوجھ سا اس کے کندھوں سے سرکا۔ واپس پارک میں آیا اور ایک کونے میں آ بیٹھا۔ درختوں کے جھرمٹ میں اس جگہ سے دور ٹکٹ کی کھڑکی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ نیلگوں شام بھی آہستہ آہستہ گہری ہونے لگی تھی۔

فارس غازی انتظار کرنے لگا۔ایک طویل اور کڑا انتظار۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ لفظ لفظ محبت کی پورشیں بھی فریب

یہ زخم زخم مسیحائیاں بھی جھوٹی ہیں

کینڈی پہاڑی شہر تھا' جیسے مری۔سرسبز پہاڑیاں'نیلا سرمئی بادلوں سے ڈھکا آسمان۔خوبصورت موسم۔اور چائے کے باغات کی سوندھی سوندھی مہک۔سیاح دور دور سے کینڈی کو انجوائے کرنے آتے تھے۔وہ نہیں کر رہا تھا۔وہ سڑک کنارے بنے اوپن ائیر کیفے میں بیٹھا تھا۔عینک پہنے' برساتی کے کالر کھڑے کیے' وہ گردن گھما کر ادھر ادھر گہری نظر ڈالتا' پھر کافی کا مگ لبوں سے لگا لیتا۔سیاہ بیگ اس کے قدموں کے ساتھ رکھا تھا۔

بائیں ہاتھ ریسٹورانٹس اور شاپس کی قطار تھی۔ابھی صبح تازہ تھی۔شاپس اور ریسٹورانٹ مالکان آ کر اپنی اپنی دکانیں کھول رہے تھے۔ ایسے میں وہ ہر کیفے کے مالک یا اسے کھولنے والے ورکر کو آنکھوں سے اسکین کرتا' پھر رد کر دیتا۔کوئی شاطر لگتا تھا' کوئی مکار۔کوئی خطرناک۔کوئی بے حد شخص۔

تھوڑی دیر بعد ایک درمیانی عمر کی سنہالی عورت ایک کافی شاپ کا لاک کھولتی نظر آئی۔ساتھ ایک ننھا لڑکا بھی تھا جو مسلسل اسے تنگ کر رہا تھا اور وہ روہانسی ہوئی اسے ڈانٹ رہی تھی۔سعدی کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔وہ وہاں سے اٹھ آیا۔اب وہ ذرا دور جا کر ایک اوپن کیفے کے باہر بیٹھ گیا۔چہرے کے آگے ایک میگزین پھیلا لیا۔اس کی نظریں اسی کافی شاپ پہ تھیں۔

کوئی گھنٹے بھر بعد وہ عورت شاپ سے باہر نکلی۔بچہ اس کے ساتھ تھا اور ہاتھ میں سامان کا تھیلا بھی تھا اور ایک لسٹ بھی۔وہ الجھی ہوئی سی' خریداری کرنے جا رہی تھی۔سعدی تیزی سے اٹھا اور فاصلہ رکھ کر اس کا پیچھا کرنے لگا۔وہ رکتی تو وہ بھی رک کر مڑ جاتا' کہیں کسی اسٹال پہ کچھ دیکھنے لگ جاتا۔

دوپہر کینڈی کے پہاڑوں پہ پھیلنے لگی۔بادلوں کی اوٹ سے سنہری کرنیں جھانکنے لگیں۔اب وہ اس کا پیچھا کرتے مارکیٹ کے وسط میں آ چکا تھا۔یہاں سے وہ مڑ گیا اور دو گلیاں عبور کر کے ایک تیسری گلی میں آیا۔ادھر کونے میں ایک لڑکا کھڑا بہت رازداری سے اپنے مخصوص گاہکوں کو ایک طرف بلا کر انہیں منشیات کی پڑیاں بیچ رہا تھا۔وہ اسے گزشتہ شام ہی تاڑ چکا تھا۔

اب سیدھا اس کے قریب گیا جو ادھر ادھر دیکھتا کسی گاہک کا متلاشی تھا۔سعدی نے اسے آنکھوں سے اشارہ کیا اور دوسری گلی کی جانب قدم بڑھا دیے۔منشیات فروش لڑکا' ذرا فاصلہ رکھ کر پیچھے آنے لگا۔جیسے ہی وہ دوسری گلی میں مڑے' سعدی گھوم کر اس کی طرف آیا اور اسے کالر سے پکڑ کر دیوار سے لگایا۔پھر رکھ کر ایک مکا اس کے منہ پہ جڑا۔

"نکڑ پہ کھڑے پولیس والے کے حوالے کر دوں گا تمہیں اگر آواز نکالی تو۔" پستول اس کی پسلی میں چبھوتے وہ غرایا تھا۔ختی سے لڑکے نے

گھبرا کر ہاتھ اٹھا دیے۔ وہ خود بھی نشے کا عادی لگتا تھا۔

”میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“ جلدی سے کہنے لگا۔

”پیسے میں تمہیں دوں گا' بدلے میں میرا ایک کام کرو گے۔ نہیں تو پولیس والے کو بلاتا ہوں میں۔“ اس کو دیوار سے لگائے' وہ غرایا۔

چند منٹ بعد وہ واپس اسی گلی میں آ کھڑا ہوا تھا جہاں وہ عورت اب بھی ایک دکان سے چیزیں خرید رہی تھی۔ وہ قریبی دکان پہ کھڑا ہو کر اخباریں کنگھالنے لگا۔ اسی لمحے وہ منشیات فروش سنہالی لڑکا اس گلی میں داخل ہوا۔ اب کے اس نے منہ پہ رومال باندھ رکھا تھا۔ وہ سیدھا اس عورت تک گیا' اور ساتھ سے گزرتے ہوئے اس کا پرس اچکا اور ایک دم بھاگ کھڑا ہوا۔ عورت پہلے لمحے تو شاک میں رہ گئی' پھر وہ چلائی۔

”میرا پرس....“

سعدی بجلی کی سی تیزی سے لڑکے کے پیچھے بھاگا۔ راستے میں اس نے جان بوجھ کر چند اسٹال بازو مار کر گرائے۔ گلی میں شور وغل برپا ہو گیا۔ کچھ اور لوگ بھی اٹھ کر بھاگے مگر سعدی نے گلی کے کونے میں اس لڑکے کو جالیا اور دبوچ کر نیچے گرایا۔ پھر پرس واپس جھپٹا۔ لمحے بھر کو اپنی گرفت ڈھیلی کی اور لڑکے نے ہاتھ پکڑے ننھا چاقو اس کے بازو میں اتار دیا۔ سعدی بے اختیار نیچے کو جھکا۔ لڑکا دم دبا کر بھاگ چکا تھا۔ وہ عورت دوڑتی ہوئی اس تک آئی تھی' بچہ بھی پیچھے تھا۔ سعدی نے خون بہاتے بازو کو دوسرے ہاتھ سے پکڑے' اٹھتے ہوئے پرس اس کو تھمایا۔ عورت نے پرس پکڑتے ساتھ ہی بچے کو تھمایا' اور لپک کر اس کا خون سے سرخ ہوتا گیا بازو پکڑا۔

”آپ کا پرس۔“ سعدی نے نقاہت بھری مسکراہٹ کے ساتھ کھڑے ہو کر کہا مگر وہ جیسے پرس کی طرف متوجہ ہی نہیں تھی۔ فکرمندی سے کچھ کہنے لگی۔ اس نے کھنکھار کر ”انگلش پلیز“ کہا۔

”اوہ... فارنر۔“ پھر ادھر ادھر دیکھا۔ ”چلو میں تمہیں ہاسپٹل لے چلوں۔“

”نہیں اٹس اوکے میں خود چلا جاؤں گا۔“ ساتھ ہی ہلکا سا کراہا۔ اب مزید لوگ جمع ہونے لگے تھے۔

”یہیں رکو میں کار لاتی ہوں۔“ عورت بھاگتی ہوئی آگے کو گئی۔ وہ قریب جمع ہوتے لوگوں سے بچنے کو چہرہ جھکائے' رخ موڑے کھڑا ہوا اور ایک طرف کو چلنے لگا جیسے دور جانا چاہ رہا ہو۔ لوگ کچھ کہہ رہے تھے مگر اتنی سنہالی وہ نہیں سمجھتا تھا۔

عورت جلد ہی ٹیکسی لے آئی مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ لوگوں سے پوچھتی اسے ڈھونڈتی دوسری گلی تک آئی جہاں وہ فرض شناس اور نیک دل انسان جو اس کا پرس بچانے کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال بیٹھا تھا' سر جھکائے' بازو کے زخم پہ اوپری جیکٹ لپیٹے چلتا جا رہا تھا۔ اس عورت کا نام کامنی روپا سنگھی تھا اور اس کا دل اس طرح اس کو دیکھ کر بہت دکھا تھا۔ وہ تیزی سے کار سے نکلی اور اس کو جالیا۔

”میں نے تمہیں رکنے کو کہا تھا فارنر۔ چلو میں تمہیں ہسپتال لے جاتی ہوں۔“

”میں خود چلا جاؤں گا' آپ کی ٹیکسی خراب ہو گی۔“ وہ چھوٹے بالوں اور عینک والا لڑکا مسکرا کر بولا تھا مگر کامنی نے خفگی سے اسے ڈپٹا۔

''کیسی باتیں کر رہے ہو' تم زخمی ہو میری وجہ سے۔ بس ہسپتال قریب ہی ہے۔''

''مجھے ہسپتال نہیں جانا۔ میں زخم خود سی لوں گا۔''

اب کے کامنی چونکی۔ اس کے انداز میں منت سی تھی۔

''اچھا ٹیکسی میں بیٹھو۔ میں فرسٹ ایڈ کٹ لا کر تمہیں شاپ پہ لے جاتی ہوں۔'' اس نے اسے قائل کرلیا۔ وہ لڑکا بدقت ٹیکسی میں بیٹھا۔ ننھا بچہ اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پہ آبیٹھا اور کامنی آگے۔

''پلیز....'' وہ پچھلی سیٹ کی پشت پہ سر گرائے' نقاہت سے آنکھیں موندے کہنے لگا تو کامنی نے بیک ویو مرر میں اسے دیکھا۔ ''مجھے ہسپتال کے اندر مت لے جایئے گا۔ پولیس میرے پیچھے ہے۔ میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ خود کو میری وجہ سے خطرے میں نہ ڈالیں۔''

سنہالی عورت ہکا بکا رہ گئی۔ اور سعدی یوسف کو انسانوں کی اتنی پہچان تو تھی کہ بند آنکھوں کے باوجود وہ جان گیا تھا کہ تیر نشانے پہ لگا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ کون لوگ تھے ان کا پتہ تو کرنا تھا

مرے لہو میں نہا کر جنہیں نکھرنا تھا

بیلوں سے ڈھکے بنگلے میں اس صبح حنین بیٹھی' لیپ ٹاپ لگائے' ہاشم کے کمپیوٹر کو ہیک کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھی۔ اس کی زنبیل میں بہت سے طریقے تھے جن کو ایک ایک کر کے وہ استعمال کر رہی تھی....

ادھر زمر یوسف کورٹ سے نکل کر اپنی فائلز اور کاغذوں میں الجھی' پارکنگ ایریا کی طرف جا رہی تھی جب اس کے ارد گرد تین سوٹ میں ملبوس افراد آ کھڑے ہوئے تھے۔ زمر نے سن گلاسز اوپر کر کے بالوں پہ ٹکائیں اور دھوپ کے باعث آنکھیں سکیڑ کر ان کو دیکھا۔

''جی؟''

''مسز زمر!'' ایک نے ادب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہارون عبید آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ اپنے آفس کے کانفرنس ہال نمبر ٹو میں۔ آپ چاہیں تو ہم آپ کو لے جا سکتے ہیں۔'' ساتھ ہی ہارون کا آئی ڈی کارڈ اسکی طرف بڑھایا۔ یہ ایک طرح کی ضمانت تھی۔

''نو تھینک یو۔ میں خود آ جاؤں گی۔'' کارڈ پکڑ کر رکھائی سے کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ البتہ دل... عجیب سے واہموں کا شکار ہو رہا تھا۔

جب اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ نہیں جائے گی' تب ہی خود بخود کار کا رخ ان کے آفس کی طرف موڑ دیا۔ پون گھنٹے بعد وہ ان کے کانفرنس روم کے دروازے کی چوکھٹ میں کھڑی تھی۔ سفید لمبی قمیص اور سیاہ کوٹ پہنے' گھنگریالے بال جوڑے میں باندھے اور بھوری آنکھوں کو مشتبہ انداز میں سکوڑے اس نے سامنے کانفرنس ٹیبل کی سربراہی کرسی پہ بیٹھے ہارون کو دیکھا۔

''مجھے یوں طلب کیا جانا پسند نہیں ہے' عبید صاحب!''

"مسز زمر! مجھے بھی آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ آیئے۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ سیاہ سوٹ میں ملبوس تھے اور سفید سرمئی بال جیل سے پیچھے کیے۔ چہرے پہ مسکراہٹ طاری کیے انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ورزیدہ نگاہوں سے ان کو دیکھتی، سربراہی کرسی کے دائیں طرف دو کرسیاں چھوڑ کر بیٹھی۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ واپس بیٹھے اور شفقت سے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں شکریہ۔ آپ بتایئے' میں کیا کر سکتی ہوں آپ کے لئے؟"

"آپ کا شوہر کہاں ہے مسز زمر' کیا آپ کو معلوم ہے؟"

زمر کے ابرو ناگواری سے بھنچے گئے۔ "میں آپ کو کیوں بتاؤں اپنے شوہر کے بارے میں۔"

"میں نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کہاں ہے' یہ پوچھا ہے کہ کیا آپ جانتی ہیں وہ کہاں ہیں؟"

اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ مسکرا کر پوچھ رہے تھے۔ زمر کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لیا۔ ماہ کامل کی رات کی چاندنی برف کی سفیدی میں بدلنے لگی۔

"وہ کراچی گیا ہے' جاب کے....."

"وہ کولمبو میں ہے میری بیٹی کے ساتھ۔ کل وہ میرے پرائیوٹ جیٹ پہ کولمبو گیا ہے۔"

زمر نے ضبط سے گود میں رکھی مٹھیاں بھینچ لیں۔ مگر چہرے کو بدقت نارمل رکھنا چاہا مگر وہ جانتی تھی کہ اس کی رنگت زرد پڑنے لگی ہے۔

"تو اس نے آپ کو نہیں بتایا؟" انہوں نے افسوس سے سر جھٹکا۔

"مجھے نہیں معلوم آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ بدقت کہہ پائی۔ دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

ہارون نے جواباً موبائل پہ چند بٹن دبائے' اور اسکرین اس کے سامنے رکھی۔ زمر نے موبائل کو نہیں چھوا صرف نگاہ جھکا کر دیکھا۔ ایئر پورٹ میں وہ آبی کے سامنے کھڑا اس سے کوئی پیکٹ لے رہا تھا۔ کیپ کی وجہ سے شکل کم واضح تھی مگر وہ فارس تھا' وہ لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ پیچھے ایئر پورٹ کا نام اور ارد گرد کا ماحول سب نظر آ رہا تھا۔

دل پہ ڈھیروں آنسو گرے۔ وہ جانتا تھا۔ وہ سب جانتا تھا۔ وہ اس کا گھر سے باہر رہنا... وہ اس کا راتوں کو دیر سے واپس آنا... وہ اس کی فون کالز... وہ جاب نہیں ڈھونڈ رہا تھا... وہ شروع سے ہاشم کے پیچھے تھا.....

"پھر؟" بظاہر ابرو اچکائے۔ وہ بمشکل خود کو کمپوزڈ رکھے ہوئے تھی۔

"کیا آپ کو معلوم ہے وہ وہاں کیوں گیا ہے؟"

وہ ان کی آنکھوں پہ نگاہیں جمائے خاموش رہی۔

"ہمارا مہمان کچھ دن قبل ہماری میزبانی سے بھاگ گیا تھا۔ وہ اسی کو ڈھونڈنے گیا ہے۔ آپ فکر نہ کریں میں ہاشم کو نہیں پتہ چلنے دوں گا۔"

''ہاشم درمیان میں کہاں سے آیا؟ وہ اس کا کزن ہے۔'' زمر کی آواز کانپی۔ نگاہیں اب بھی ہارون پہ جمی تھیں۔ انہوں نے مسکرا کر پیچھے ہوتے، دلچسپی سے اسے دیکھا۔

''آپ کو معلوم ہے میں کیا بات کر رہا ہوں فارس کو بھی معلوم ہے۔'' زمر کی آنکھوں میں ایک دم ڈھیروں جذبات ایک ساتھ ابھرے۔ اور ان سارے جذبات نے اس کی آنکھوں کو سرخ گلابی سا کر دیا۔ وہ ذرا چونکے۔ ''آپ کو لگتا تھا وہ نہیں جانتا؟''

زمر گردن موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ بہت سے آنسو اندر اتارے۔

''خیر میں نے یہاں آپ کو یہ بتانے کے لئے نہیں بلایا کہ وہ اتنے عرصے سے میری بیٹی کے ذریعے ہمارے مہمان سے رابطہ رکھے ہوئے تھا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ میری بیٹی کے ساتھ کیوں ہے؟''

زمر نے چہرہ ان کی طرف موڑا تو آنکھیں خشک تھیں مگر سرخی مائل سی۔ ''اپنے جاسوسوں سے پوچھ لیں۔'' اور پرس اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب مزید بیٹھنا دوبھر ہو گیا تھا۔ انہوں نے محظوظ ہو کر گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

''تو مسز کاردار آپ کی شادی کے بارے میں درست کہتی ہیں۔ آپ دونوں واقعی الگ ہونے جا رہے ہیں۔ مگر کب؟''

''یہ بھی آپ مسز کاردار سے پوچھ لیں۔'' ایک پرتپش نظر ان پہ ڈال کر وہ مڑی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''میرے اندازے درست ثابت کرنے کا شکریہ مسز زمر۔ مجھے یقین ہے کہ ہم جلد دوبارہ ملیں گے۔ آپ کے بہت سے کام ایسے ہیں جو صرف میں سیدھے کر سکتا ہوں۔''

مگر کانفرنس ہال سے نکلتے وقت، اپنے جذبات اور آنسوؤں پہ قابو پاتی زمر نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس مکروہ انسان سے دوبارہ کبھی نہیں ملے گی۔ وہ غلط تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اپنی گلی میں اپنا ہی گھر ڈھونڈتے ہیں لوگ
امجد یہ کون شہر کا نقشہ بدل گیا

وہ رات ان چاروں نے عجیب سی کیفیت میں بسر کی تھی۔

حنین ڈائننگ ہال میں لیپ ٹاپ کھولے، پیر اوپر کرسی پہ چڑھائے، ناخنوں کو دانتوں سے کترتی اسکرین کی طرف متوجہ تھی۔ ایک دفعہ پھر سے.... نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا.... وہ بار بار ہاشم کے کمپیوٹر پہ ''حملہ'' کرتی اور ہر دفعہ اس کے سسٹم کا مضبوط نظام اس کے حملوں کے خلاف بھرپور مدافعت کر کے ان کو ناکام بنا دیتا۔ پے در پے ناکامی اسے پاگل کر رہی تھی۔

زمر گویا خود کو گھسیٹتی ہوئی گھر کے اندر آئی اور اس کو دیکھے بنا.... سیدھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اندر آ کر اس نے دروازہ بند کر لیا اور پھر.... دروازے کے ساتھ نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ سر پیچھے ٹکائے اس نے آنکھیں موندیں تو خود بخود گرم گرم پانی ٹپ ٹپ کے چہرے کو

بھگونے لگا۔

وہ جانتا تھا۔ وہ سب جانتا تھا' مگر اس نے مجھے نہیں بتایا۔ اس نے بھیگی آنکھیں کھولیں اور دکھ سے اپنے اردگرد خالی در و دیوار کو دیکھا۔ پھر اوپر نگاہیں اٹھائیں۔ ان میں شکوہ تھا۔ صدمہ تھا۔ اس کا دل بری طرح سے ٹوٹا تھا۔

کیا میں اتنی بری ہوں کہ وہ میرے ساتھ کچھ شیئر نہیں کر سکتا تھا؟ میں نے تو ہمیشہ سب شیئر کیا۔ جب نفرت تھی تب بھی۔ جب پیار ہوئی تب بھی۔ نہیں بتائی تو ایک بھی بات نہیں بتائی کہ کہیں وہ خود کو نقصان نہ پہنچالے مگر اس نے تو کچھ بھی نہیں بتایا۔ ایسا کیوں کرتا ہے وہ ہمیشہ؟ اسے ہر دفعہ نئے سرے سے پہچاننا اتنا کٹھن کیوں ہوتا جا رہا ہے؟

چہرہ جھکائے اس نے سختی سے آنکھیں رگڑیں مگر پانی ابل ابل رہا تھا۔

(شاید میں اسی قابل تھی۔ میں نے کتنی زیادتیاں کیں اس کے ساتھ۔ اسے مجھ پہ اعتبار ہی نہیں کرنا چاہیے اب تو۔ مجھ سے زیادہ اسے اس پلاسٹک کی گڑیا پہ بھروسہ ہے تو ٹھیک ہے۔ میں اسی کی مستحق تھی۔) اب کے اس نے سر گھٹنوں پر رکھ دیا اور چہرہ ایک طرف موڑے' خالی نظروں سے دیوار کو دیکھتی' آنسو بہائے گئی۔

(اور میں کس حیثیت سے اللہ سے شکوے کر رہی ہوں؟ جو لوگ اپنی ذاتی عبادات میں اچھے نہیں ہوتے' جو نماز کے بعد دعا نہیں مانگتے' اللہ سے اپنا رشتہ کھو چکے ہوتے ہیں' ان کو کیا حق ہے کہ وہ اللہ کو پھر سے مخاطب کر سکیں؟ ایک زمانہ تھا جب میری نمازیں بے جان' بے روح نہیں ہوتی تھیں۔ جب میں جائے نماز پہ بیٹھ کر' خوشی غمی کی بات اللہ تعالیٰ کو کہہ لیتی تھی۔) آنسو اب بہنا رک گئے تھے اور وہ یاد کرنے لگی تھی۔ (تب میں کتنی زندگی سے پر تھی۔ سعدی کو بھی یہی سکھایا تھا۔ وہ سیکھ گیا۔ میں بھول گئی۔ اتنی سخت دل' اتنی تلخ کلام' یہ میں کیا بنتی جا رہی تھی؟ اوہ زمر... اب تو تم خود کو بھی نہیں پہچان پا رہی۔)

فارس نے اس کو اعتبار کے قابل نہیں سمجھا' اس ایک بات نے اس کے اندر کے پراعتماد انسان کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ مگر اب وہ کیا کر سکتی تھی۔ وہ اتنی دور آچکی تھی' اتنی کھو چکی تھی' کہ اب اس کا سخت دل پہلے کی طرح اللہ کے کلام پہ نہیں پگھلتا تھا' نہ اللہ سے کلام کرنے کا ڈھنگ یاد رہا تھا۔ وہ اب کیسے اس نرم مزاج' اچھی زمر کو واپس لائے جو انتقام اور تلخی بھرے دوسرے جذبات سے نا آشنا صرف محبت اور قربانی کا پیکر تھی۔ وہ اس زمر کو کہاں سے ڈھونڈے؟

اور سمندروں پار... شاید سمندروں پار... فارس گویا تھک کر مگر چوکنا سا درختوں کے جھرمٹ کے بیچ بیٹھا تھا۔ اردگرد جگہ اب سنسان ہو چلی تھی۔ لوگ قریباً جا چکے تھے۔ ایسے میں اس کی چبھتی ہوئی نظریں اس ٹکٹ کیبن پہ جمی تھیں۔ پچھلی رات اور آج کا سارا دن وہ مختلف جگہوں پہ بیٹھا انتظار کرتا رہا تھا (آج آبی نے کسی سیمینار میں جانا تھا سو اس کے پاس نہیں آئی تھی۔) مگر ٹکٹ کلرک کے پاس کوئی نہیں آیا تھا۔

اور جانے رات کتنی بیت چکی تھی جب وہ ایک دم چونک کر سیدھا ہوا۔

ایک آدمی برساتی اور ٹوپی اوڑھے کیبن کی طرف آ رہا تھا۔ کھڑکی کے پاس رک کر اس نے ٹکٹ چیکر سے کچھ پوچھا۔ وہ جواباً نفی میں سر

ہلاتے کچھ بتانے لگا۔فارس اس جگہ سے کافی دور تھا' اور اس آدمی کی اس جانب سے پشت تھی' مگر وہ اس کی جسامت' اس کی چال ڈھال کو...لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔

بات کرتے ہوئے دور کھڑے نوارد نے مڑ کر اطراف کا سرسری جائزہ لیا تو اس کا چہرہ واضح ہوا۔

وہ کرنل خاور تھا۔

فارس نے گہری سانس اندر کو کھینچی۔

تو خاور نے سعدی کا پین چرا لیا تھا' اور اب وہ اس پین کے ذریعے سعدی تک پہنچنا چاہتا تھا۔وہ دونوں اکٹھے فرار ہوئے تھے مگر اب اکٹھے نہیں تھے۔پھر کہاں گیا سعدی؟ خاور کے جانے تک وہ وہیں بیٹھا سوچتا رہا' پھر قریباً گھنٹے بعد وہ وہاں سے نکل آیا۔

اب وہ کیا کرے؟

ادھر کینڈی میں....وہ عورت سعدی کو اپنی کافی شاپ کی پچھلی طرف سے داخل کر کے کچن میں لے آئی تھی۔فارمیسی سے ضروری سامان اس نے راستے میں خرید لیا تھا۔سعدی کو وہاں بٹھا کر اس نے بچے کو شاپ کے لاؤنج میں بھیجا اور خود دوسرا اسٹول کھینچ کر بیٹھی۔

''میرے والد آرمی آفیسر ہیں۔''(سعدی کا دل دھک سے رہ گیا۔فورسز سے تعلق رکھنے والوں کی شاپ پہ وہ کیوں آ گیا؟ اوہ نو۔)''ڈرو نہیں' وہ ریٹائرڈ ہیں۔ڈاکٹر نہیں مگر چھوٹے موٹے ٹانکے لگا لیتے ہیں۔''

وہ ایک رومال اپنے خون سے سرخ ہوئے بازو پہ باندھے اور اسے ہاتھ سے زور سے دبائے' درد کو برداشت کرتا خاموشی سے سنتا گیا۔

''اب بتاؤ' پولیس سے کیوں چھپ رہے ہو؟''

''بتایا تو آپ مجھے نکال دیں گی۔''

''جانتی ہوں تم کچھ گڑبڑ ہو' مگر اتنی انسانوں کی پہچان تو مجھے بھی ہے کہ اچھے اور برے میں تمیز کر سکوں۔بتا دو۔''وہ سنجیدہ تھی۔تبھی بچہ ایک بوڑھے آدمی کے ساتھ واپس آیا جو گھور گھور کر سعدی کو دیکھ رہا تھا۔کامنی اور اس کا سنہالی میں ایک قدرے تلخ مکالمہ ہوا' پھر وہ بیٹھ کر خاموشی سے سعدی کا زخم صاف کرنے لگا۔

''میں....''اس نے چہرے پہ دنیا جہاں کی سادگی اور معصومیت طاری کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔''ایک لڑکی کو پسند کرتا ہوں۔مگر غریب ہوں۔اس کا باپ مجھے پسند نہیں کرتا....میں نے سوچا اسے کچھ بن کر دکھاؤں' اس لئے انگلینڈ سے یہاں آ گیا۔''

''وہاں کدھر رہتے تھے....''وہ غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''لیڈز میں۔پڑھائی بھی چھوڑ دی اس کے پیچھے....پیسے کمانے ادھر آیا۔اس کے قریب رہنا چاہتا تھا' مگر اس کے باپ کو جب پتہ چلا تو اس نے....''درد سے اس نے آنکھیں میچیں۔بوڑھا اب اس کے ٹانکے لگا رہا تھا۔''اس نے مجھے نوکری سے نکلوایا' فلیٹ سے دربدر کیا' بندے میرے پیچھے لگا دیئے' کاغذات غائب کرا دیے' اور پولیس میں لکھوا دیا کہ میں الیگل ہوں' اور چور ہوں۔وہ چاہتا ہے میں ملک چھوڑ کر چلا

جاؤں مگر میں اس لڑکی کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا۔" آدمی گا ہے بگا ہے اس پہ نظر ڈالتا چپ چاپ اپنا کام کرتا رہا۔

"نام کیا ہے اس لڑکی کا؟" کامنی نے جتنی ڈیکٹیو فلمیں دیکھ رکھی تھیں' ان کا نالج استعمال کرتے ہوئے اس نے ترنت سوال در سوال شروع کر دیے۔

"سونیا۔" جواب تیار تھا۔

"اور تمہارا؟"

"شفیع.... شفیع احمر۔" جواب تیار نہیں تھا' جو منہ میں آیا بول دیا۔

"اب کیا کرو گے۔" عورت نے ذرا ہمدردی سے پوچھا۔ اسے وہ بے ضرر لگا تھا۔

"پیسے کماؤں گا' بڑا آدمی بنوں گا۔ پھر دیکھتا ہوں وہ کیسے اس کی شادی مجھ سے نہیں کرتے۔" مسکرا کر بولا۔ عورت نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

"تم آج کل کے نوجوان۔ تم لوگوں کی سوچ شادی سے آگے جاتی ہی نہیں۔" وہ افسوس کر رہی تھی۔ "اپنا ملک' اپنی فیملی' کسی بڑے مقصد کے لئے جینا' یہ باتیں تم کیوں نہیں سمجھتے۔" وہ اداسی سے مسکرایا۔

"میں کیا کروں' مجھے سمجھ ہی نہیں آتیں یہ باتیں۔"

پٹی ہو چکی تھی۔ بوڑھا اس پہ ایک ناپسندیدہ نظر ڈال کر چیزیں سمیٹ کر خاموشی سے اٹھ گیا۔

"پاپا کے رویے کا برا نہ ماننا۔ وہ ایسے ہی ہیں۔ اجنبیوں پہ اعتبار نہیں کرتے۔ انہیں لگتا ہے کہ میں بے وقوف ہوں جو لوگوں پہ اعتبار کر کے انہیں گھر کے اندر لے آتی ہوں۔ مونچو کے باپ کو بھی ایسے ہی لائی تھی۔ پھر وہ ہمیں چھوڑ کر اپنی ایک اسٹوڈنٹ کے ساتھ بھاگ گیا۔" وہ اس تنگ سی پینٹری کی چیزیں درست کرتی کہہ رہی تھی۔ وہ درمیانی عمر کی عورت تھی' بال اسٹیپ کٹنگ میں کٹے تھے' کافی دبلی اور سانولی تھی مگر آنکھوں میں سکون تھا' چمک تھی۔ اور اداسی بھی۔

"مگر میں یہ سوچتی ہوں شفیع کہ اگر انسان انسانوں پہ اعتبار ہی نہ کر سکے تو اس دنیا کو ہی ختم ہو جانا چاہیے۔ اب ہر کوئی تو ہم سے جھوٹ نہیں بولتا نا۔"

سعدی ذوالفقار یوسف خان کے دل کو کسی نے الٹی چھری سے کاٹ دیا مگر بظاہر وہ جبراً مسکرا دیا۔ "ایسا ہی ہے۔"

"خیر' تم ابھی زخمی ہو' یہ دوا کھا لو اور ادھر..." ایک پرانے کاؤچ کی طرف اشارہ کیا۔ "سو جاؤ۔ ہماری کافی شاپ کے ورکرز ادھر ہی سوتے ہیں کبھی کبھار۔ صبح تک یہیں رہو پھر بے شک چلے جانا' پیسے کمانے۔" مسکرا کر وہ کاؤچ پہ کشن برابر کر رہی تھی۔ ایسی پھرتیلی اور تیز تیز کام کرنے والی عورت تھی وہ۔ محنتی سی۔

سعدی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "تھینک یو۔ میں صبح چلا جاؤں گا۔"

''اور سنو۔'' وہ جاتے جاتے مڑی۔ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر گویا یاد دلایا۔ ''ایسا کچھ بھی مت کرنا۔ چوری وغیرہ.... کہ میرے پاپا دوبارہ میری جج منٹ پہ اعتبار نہ کر سکیں۔ مجھے پتہ ہے تم ایسے نہیں ہو' مگر خیال رکھنا۔''

سعدی نے مسکرا کر سر کو خم دیا۔ ''آپ کا نام؟''

''کامنی۔'' وہ مسکرا کر بولی اور بتی بجھا کر باہر چلی گئی۔ سعدی نے دوا کی گولیاں جوتے کی نوک سے مسل کر فرش پہ جھاڑ دیں' گویا ان کو غتا کر دیا۔ اسے درد ہو رہا تھا مگر وہ ''بے ہوش'' ہو کر نہیں سو سکتا تھا۔ اسے الرٹ رہنا تھا۔ انہی خیالات میں گھرا وہ کاؤچ پہ لیٹ گیا اور آگے کا لائحہ عمل تیار کرنے لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہم نے کہا نہ تھا کہ نہ بدمست ہو کے چل
مہنگی بہت پڑے گی یہ عزت ادھار کی

اس صبح سے سردی کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ جنوری کا آخری عشرہ چل رہا تھا' دھند میں ذرا کمی آ گئی تھی۔ ایسے میں اس پرشکوہ اور بلند عمارت کے بالائی فلور کے کارنر آفس کی شیشے سے ڈھکی دیوار کے آگے سے بلائنڈز ہٹے تھے اور تیز روشنی اندر گر رہی تھی۔ ہاشم کوٹ' ویسٹ اور ٹائی میں ملبوس' کمر سیدھی رکھ کر کرسی پہ بیٹھا' لیپ ٹاپ کے کی بورڈ پہ دونوں ہاتھوں سے تیز تیز ٹائپ کر رہا تھا۔ اس کی سنجیدہ نظریں اسکرین پہ جمی تھیں۔ دفعتاً دروازہ کھلا تو اس نے چونک کر چہرہ اٹھایا۔

جواہرات چوکھٹ میں کھڑی تھی۔ بند گلے کے سیاہ ٹاپ اور کانوں میں دمکتے ہوئے ہیرے پہنے' وہ مسکارے سے سجی آنکھوں کو اس پہ جمائے قدم قدم چلتی قریب آئی۔

''کہو۔ کیا بات تھی؟''

ہاشم نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ ''میں نے آپ کو نہیں بلایا۔''

جواہرات کی آنکھوں میں اچنبھا ابھرا۔ ''تو پھر تمہاری سیکرٹری نے مجھے فون کر کے کیوں کہا کہ کاردار صاحب میٹنگ کے لئے بلا رہے ہیں۔ تمہارا موبائل آف جا رہا تھا' سو میں فوراً چلی آئی۔'' ہاشم نے تیزی سے انٹرکام اٹھایا تھا۔

اگلے ہی لمحے حلیمہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔

''میں نے غلط نہیں کہا' میم۔ نوشیرواں کاردار نے مجھے آپ کو کال کرنے کو کہا تھا۔''

ہاشم نے نوشیرواں کی ایکسٹینشن ملائی۔ اس کے ابرو تنے ہوئے تھے اور آنکھوں میں برہمی تھی۔ شیرو نے جان بوجھ کر ''مسٹر کاردار'' کہلوایا تھا تاکہ جواہرات غلط سمجھے' وہ جانتا تھا۔

''شاہ نوشیرواں کو میرے آفس آنے کا کہو۔'' حکم جاری کر کے اس نے فون رکھا اور حلیمہ کو بھیج دیا۔

"کوئی بات نہیں ہاشم!" وہ جو کرسی کی پشت پہ کہنی جمائے ابھی تک کھڑی تھی نرمی سے بولی۔ ہاشم نے صرف ایک خفا نگاہ اس پہ ڈالی۔

"رویہ کس کا خراب ہے آپ جانتی ہیں۔"

"وہ چھوٹا ہے نا سمجھ ہے تم برداشت کا مظاہرہ کر لو اور...."

"تا کہ وہ کبھی بڑا نہ ہو۔" پہلے تلخی سے بولا پھر سر جھٹکا اور گہری سانس لی۔ "خیر میں پرانی باتوں کو بھلا کر موو آن کرنے کے لئے تیار ہوں اگر وہ بھی اپنا رویہ بدلے۔"

"وہ بدلے گا' آئی ایم شیور۔ اس نے اسی لئے ہمیں اکٹھا کیا ہے۔" وہ اس کا دل نرمی سے صاف کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہاشم خاموشی سے سنتا رہا۔

دروازہ بنا کسی دستک کے کھلا اور نوشیرواں نظر آیا۔ جواہرات نے مڑ کر دیکھا۔ ویسٹ میں ملبوس' کوٹ کے بغیر' آستین کہنیوں تک موڑے' بال جیل سے سیٹ کیے وہ سنجیدہ سا کھڑا تھا۔ جواہرات مسکرا کر ایک قدم آگے بڑھی' جب شیرو چوکھٹ کے سامنے سے ہٹا اور.... (جواہرات کی مسکراہٹ عنقا ہوئی)... اور پیچھے کھڑی زمر نظر آئی۔ سیاہ کوٹ' شانوں پہ سفید دوپٹہ اور پونی میں بندھے گھنگریالے بال' چہرے پہ مسکراہٹ۔ (کل رات اپنے کمرے میں بیٹھ کر رونے والی زمر سے وہ مختلف لگ رہی تھی)۔

"گڈ مارننگ مسز کاردار" پھر پیچھے بیٹھے ہاشم کو دیکھ کر سر کو خم دیا۔ "مسٹر کاردار!"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ماں کو دیکھا' جو بالکل ششدری نوشیرواں اور زمر کو اندر داخل ہوتے دیکھ رہی تھی۔ شیرو تھری سیٹر صوفے پہ جا بیٹھا اور ٹانگ پہ ٹانگ جمالی' جبکہ زمر ساتھ رکھے سنگل صوفے پہ گھٹنے ملا کر بیٹھی اور میز پہ فائلز رکھ کر کھولنے لگی۔

"گڈ مارننگ زمر!" اب کے ہاشم مسکرا کر بولا اور واپس اپنی کرسی پہ ٹیک لگا کر بیٹھا۔ جواہرات ابھی تک کھڑی تھی۔ "کہیے' کیسے آنا ہوا؟ فارس کی جاب کیسی جا رہی ہے؟ میں نے اپنے دوست سے کہہ کر لگوائی ہے امید ہے کچھ عرصے ٹک کر کام کرے گا۔"

زمر نے بھوری آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ "میں یہاں ذاتی نہیں' پروفیشنل حیثیت سے آئی ہوں۔"

"کیا مطلب؟" جواہرات ماتھے پہ بل لئے اسے گھور رہی تھی۔

"مسز زمر میری وکیل ہیں۔"

ہاشم کی مسکراہٹ برقرار رہی (جواہرات کی آنکھوں کی تپش بڑھتی گئی) اور وہ بولا۔

"شیرو' تمہیں کس سلسلے میں ضرورت پڑ گئی لائیر کی؟" دوستانہ انداز اپنایا۔

"اپنی کمپنی میں اپنے شیئرز کی ملکیت کے سلسلے میں۔" وہ رکھائی سے بولتے ہوئے ہاشم کو دیکھ رہا تھا۔

"تم میرے بیٹے کو بہکا کر اس کو جائیداد میں اپنا حصہ مانگنے پہ اکسا رہی ہو' ہے نا؟" جواہرات خود پہ قابو نہ رکھ سکی۔ "خوب سن لو کہ شیرو جو مانگے گا میں اس کو دوں گی۔ بولو نوشیرواں جو بھی چاہیے تمہیں' مگر اپنی وکیل کو یہاں سے بھیجو۔" ہاشم کھنکھارا۔ گویا تھمنے کا اشارہ کیا۔

"مسز کاردار مجھے آپ لوگوں کی ذاتی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور میں صرف تب جاؤں گی جب نوشیرواں مجھے جانے کے لئے کہیں گے۔ کیوں نوشیرواں؟" سنجیدگی سے شیرو کو دیکھا۔

"یہ یہاں سے نہیں جائیں گی۔"

"تم مجھے بتاؤ، تمہیں مزید شیئرز چاہئیں شیرو!" جواہرات نے زمر کو نظر انداز کر کے پوچھا۔ اور پہلی دفعہ نوشیرواں کو احساس ہوا کہ زمر نے اس کا آئیڈیا کیوں مسترد کر دیا تھا۔

"مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے ممی!" وہ باری باری ان دونوں کو دیکھ کر بولا۔ صوفے کی پشت پہ بازو پھیلائے، ٹانگ پہ ٹانگ جمائے اٹھی گردن کے ساتھ اسے پہلی دفعہ اپنا آپ معتبر لگا تھا۔

ہاشم نے آنکھیں سکوڑ کر زمر کو دیکھا۔ "تو پھر؟" وہ بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا۔

"نوشیرواں کاردار نے اپنے شیئرز کا آدھا حصہ....." وہ فائل کھولتے ہوئے خبرنامہ پڑھنے کے انداز میں بتانے لگی.... "یعنی کل شیئرز میں سے 25 فیصد شیئرز کی ملکیت کسی اور کو دے دی ہے۔"

ہاشم کرنٹ کھا کر سیدھا ہو کر بیٹھا۔ ساری مسکراہٹیں غائب ہوئیں۔ آنکھوں میں حیرت اور غصہ در آیا۔ "تم ایسا کیسے کر سکتے ہو؟ وہ صرف تمہاری کمپنی نہیں ہے۔"

"مسٹر کاردار، نوشیرواں نے صرف اپنے حصے کے شیئرز آگے دیے ہیں۔ سارا پیپر ورک ہو چکا ہے۔ آپ اس وقت سری لنکا میں تھے ورنہ ہم آپ سے کچھ پوچھ لیتے۔" بہت تہذیب اور نرمی سے وہ بولی تھی۔ ہاشم نے ناگواری سے شیرو کو دیکھا۔ جواہرات بھی اتنے ہی غصے میں کھڑی تھی۔

"میں دو دن میں اس انتقال کو ختم کروا سکتا ہوں نوشیرواں۔"

"کمپنی کے بائی لاز کے مطابق آپ ایسا نہیں کر سکتے۔" زمر سادگی سے بولی تھی۔

"بائی لاز میں نے لکھے تھے، ان کے سارے جھول معلوم ہیں مجھے۔" غصے سے اس نے میز پہ ہاتھ مارا۔

نوشیرواں خاموش سرد نگاہوں سے ہاشم کو دیکھ رہا تھا۔ اسے خوشی نہیں مل رہی تھی۔ انتقام خوشی نہیں دیتا، مگر سکون مل رہا تھا۔

"ہاشم، آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں، لیکن مجھے معلوم ہے کہ مسز کاردار آپ کو یہ نہیں کرنے دیں گی۔" زمر نے اسی سادگی سے خود کو گھورتی جواہرات کو دیکھا۔ "کیونکہ نوشیرواں آپ کے بھائی ہیں، اور ایک بھائی دوسرے کی خواہش کا احترام نہ کرے تو وہ اس کو کھو دیتا ہے۔ ایک وکیل کی حیثیت سے میں یہ چاہوں گی کہ معاملہ صلح صفائی سے نپٹ جائے۔ ہاشم نوشیرواں آپ کا بھائی ہے اور وہ یہ سب اچھی نیت سے کر رہا ہے صرف اتنے سالوں کے اپنے برے سلوک کے مداوے کے لئے۔"

اس آخری بات پہ ہاشم چونکا مگر جواہرات غصے میں بولنے لگی۔

''کیا تمہارے خاندان والوں کو دے دیے ہیں اس نے شیئرز؟ ہاں؟''

''میں نے اپنے خاندان والے کو دیے ہیں۔'' شیرو چبا چبا کر بولا۔ جواہرات کا سانس رک گیا۔ ''فارس؟'' مگر ہاشم آہستہ سے سیدھا ہو کر بیٹھا۔ ایک دم سے سب اسے سمجھ میں آ گیا تھا۔

''نہیں۔'' شیرو اٹھا اور جا کر دروازہ کھولا' پھر کسی کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

جواہرات اور ہاشم نے بے اختیار اس طرف گردن موڑی اور جب شیرو سامنے سے ہٹا...تو...انہوں نے دیکھا...قدم مقدم چلتی اس کے پہلو میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ بلیک کوٹ اور اسکرٹ میں ملبوس' با اعتماد انداز میں گردن اٹھائے۔

علیشا۔ رب کا کردار۔

زمر فائلز اٹھا کر کھڑی ہوئی اور مسکرا کر جواہرات کو دیکھا۔

''کتنی لکی ہیں آپ کہ اپنی اولاد کی خوشیاں دیکھ رہی ہیں۔ مگر آف کورس ہیں یہ کبھی نہیں سمجھ سکتی۔'' اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے نوشیرواں کو سر کے خم سے اشارہ کیا۔ جیسے ہی وہ باہر نکلی' شیرو ایک سرد نگاہ ان دونوں پہ ڈالتا مڑ گیا' اور علیشا...جو بالکل سپاٹ سی کھڑی تھی' کسی روبوٹ کی طرح شیرو کے ساتھ ہو لی۔

پیچھے کمرے میں محض ایک ہولناک سناٹا رہ گیا۔

باہر آ کر علیشا نے نوشیرواں کو روکا تھا۔

''شو ڈاؤن ہو گیا؟ اب میرا کیا ہو گا؟''

''تم ابھی اسی اپارٹمنٹ میں رہو گی۔ ڈرائیور تمہیں چھوڑ آئے گا۔ جب تمہیں قصر میں لانے کا وقت ہو گا تو میں لے آؤں گا۔'' وہ معتبر انداز میں کہتا اس کے ساتھ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ زمر نے مسکرا کر ان دونوں کو جاتے دیکھا اور حلیمہ کی طرف مڑی۔

''حلیمہ...کیا مجھے آپ کا نمبر مل سکتا ہے؟''

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

عقل ہر بار دکھاتی تھی جلے ہاتھ اپنے
دل نے ہر بار کہا آگ پرائی لے لے

اس چھوٹی سی پینٹری کے باہر سے مکھیوں کے بھنبھنانے جیسی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک نسوانی اور ایک مردانہ آواز جیسے دبے دبے انداز میں جھگڑ رہی تھیں۔ سعدی ان آوازوں کا پیچھا کرتے' گردن ادھر ادھر گھماتا' پینٹری سے باہر آیا تو سامنے مستطیل لمبا سا کچن تھا۔ اندر ایپرن پہنے کھڑا بوڑھا تلخی سے کچھ کہہ رہا تھا اور اس کے سامنے اتنی ہی تلخی سے جواب دیتی کامی کی اس طرف پشت تھی۔ وہ سنہالی بہت کم سمجھتا تھا' مگر ان کے انداز کو سمجھنے کے لئے زبان جاننا ضروری نہ تھا۔ جانتا تھا کہ موضوع گفتگو وہی ہے۔ بوڑھا اس کو رکھنے کے لئے تیار نہیں

اور کامنی اس کے حق میں ہے۔

''گڈ مارننگ۔'' ہلکا سا کھنکار کر بولا تو ان دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ بوڑھے نے فوراً ناگواری سے منہ پھیر لیا' اور کام کرنے لگا' جبکہ کامنی شرمندہ سی اس تک آئی۔

''تمہارا زخم کیسا ہے؟'' اس نے ہمدردی سے اس لڑکے کو دیکھا جس کے بال بہت چھوٹے چھوٹے سے اگے تھے' اور چہرے پہ ہلکی ہلکی شیو بڑھی تھی' تھوڑی کی ذرا گھنی فرنچ۔ گردن پہ زخم کا نشان۔ بازو پہ بندھی پٹی۔ وہ عینک کے پیچھے نقاہت سے مسکرایا۔

''اچھا ہوں۔ بس ذرا چکر آ رہے ہیں۔ سوچا تھا ابھی چلا جاؤں مگر....''

کامنی کے چہرے پہ شفقت اور ہمدردی ابھری۔ ''تم جب تک چاہو یہاں رہ سکتے ہو' بابا کی باتوں کا برا نہ مانو۔''

''آپ پہلے ہی میرے لئے بہت کر چکی ہیں' اب مجھے جانا ہو گا۔ مجھے پیسے کمانے ہیں۔'' کامنی چپ ہو گئی۔ مڑ کر باپ کو دیکھا جو خفا خفا سا کام کر رہا تھا۔ سعدی نے بھی ایک گہری نظر سنہالی بوڑھے پہ ڈالی اور واپس مڑ گیا۔

پینٹری کے کاؤچ پہ واپس جب وہ بیٹھا تو سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔ عورت اچھی تھی' مگر بوڑھا؟ اسے چند دن کے لئے ایک محفوظ چھت چاہیے تھی۔ پھر ہی وہ اس ملک سے نکلنے کا لائحہ عمل تیار کر سکتا تھا۔ اسے آج دوپہر میں واپس نہیں جانا تھا' اسے ہر صورت یہاں رکنا تھا۔ کیا کرے جو کامنی خود اس کو روک لے؟ کیا تھا سعدی یوسف کا بہترین ٹیلنٹ؟

وہ اٹھا اور باہر آیا۔ کامنی سے پوچھا کہ وہ ای میل چیک کر سکتا ہے کہیں؟ اس نے پوری فراخ دلی سے اپنا لیپ ٹاپ اس کے حوالے کر دیا۔ وہ کچن کے ہی ایک کونے میں' وائی فائی کے قریب بیٹھ گیا اور کام کرنے لگا۔

سنہالی بوڑھا وقفے وقفے سے پینٹری میں آ جا رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ زخمی مشکوک نوجوان لیپ ٹاپ میں منہمک ہے تو اب کے جب وہ پینٹری میں آیا تو تیزی سے اس کے کاؤچ کی طرف لپکا۔ کشن تلے دبا اس کا بیگ نکالا اور کھولا۔ وہ مختلف پاسپورٹ' نوٹوں کا بنڈل' پستول' مختلف سرنجز' ایسی مشکوک چیزیں' اور وہ پھٹا ہوا پوسٹر جو کہہ رہا تھا کہ وہ ایک تامل جاسوس ہے۔ وہ اسی کا تھا۔ وہ پہچان گیا تھا۔ زپ بند کرتے بوڑھے کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ ماتھے پہ پسینہ آ رہا تھا۔ وہ واپس آیا تو بالکل خاموشی سے کچن میں کام کرنے لگا۔ وہ لڑکے کو بالکل نہیں دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اتنی قبریں نہ بناؤ میرے اندر محسن

میں چراغوں کو جلاتے ہوئے تھک جاتا ہوں

وہ صبح فارس کے لئے پہلے سے زیادہ پریشان کن اور مایوسی بھری تھی۔ وہ آبدار کی معلومات کے مطابق' ہارون عبید کے ہوٹل کے باہر... چند گلیاں چھوڑ کر... کھلنے والے مین ہول تک گیا جہاں سے وہ بھاگے تھے۔ وہ آگے پیچھے کی ایک ایک عمارت میں گیا۔ جہاں کے اسٹریٹ

کیمرز کے رخ وہاں تھے۔ چند گھنٹوں کی "محنت" کے بعد اس نے ایک کیمرے کی ٹیپ حاصل کر لی اور دوسری جگہ جب رشوت سے کام نہ چلا تو فائر الارم بجا دیا اور اسی بھگدڑ میں ان کا پورا ڈی وی آر اٹھا کر لے آیا۔

اپارٹمنٹ میں واپس آ کر اس نے فوٹیج دیکھی۔ اندھیرے میں وہ دونوں نکل کر بھاگتے ہوئے دوسری گلی میں گئے تھے۔ سعدی کا ایک ہیولہ سا تھا۔ وہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ اسے پہچان سکتا تھا۔ بے اختیار اسکرین کو ہاتھ سے چھوا۔ پھر سر جھٹکا۔ خاور کو دیکھ کر ماتھے پہ بل پڑ گئے، مگر خود کو قابو کر لیا۔ اب وہ یہ جانتا تھا کہ وہ دونوں کس گلی میں مڑے تھے۔ دوپہر تک وہ واپس اس گلی میں پہنچ چکا تھا۔ اس دفعہ اسے چند نوٹ دینے پڑے، اور وہیں آفس میں فوٹیج دکھا دی گئی۔ وہ دونوں ایک ٹنگ ٹنگ رکشے میں بیٹھے تھے۔ اس نے رکشے کا نمبر نوٹ کر لیا اور قریبی رکشہ اسٹینڈ تک آیا۔

وہاں کوئی بھی اس رکشے والے کی معلومات دینے پہ راضی نہ تھا۔ چند نوٹ، مزید دیے تو شام تک وہ رکشہ ڈرائیور مل گیا۔ اس کو اکیلے کونے میں لے جا کر فارس نے اس سے پوچھنا چاہا کہ ان دونوں کو کہاں اتارا تھا۔ وہ بولنے کی بجائے بھاگنے لگا، مگر فارس نے اسے گریبان سے پکڑ کر دیوار سے لگایا، اور پہلے غصے سے پھر نرمی سے پوچھا۔ وہ کچھ بھی بتانے کو تیار نہ تھا۔ مگر پستول کی پہلی جھلک پہ وہ ٹوٹ پڑا۔

جس جگہ ٹنگ ٹنگ نے ان دونوں کو ماہ کال کی اس رات پہ اتارا تھا، وہاں پہنچتے پہنچتے رات بیت گئی۔ مگر معلوم پڑا کہ فوٹیجز غائب ہیں۔ یقیناً خاور نے اپنے قدموں کے نشان صاف کرا دیے تھے۔

رات کو جس وقت وہ واپس اپارٹمنٹ میں پہنچا، تھکا ہوا لگتا تھا۔ شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔ چپ چاپ آ کر صوفے پہ بیٹھ گیا۔ سارے دن کی محنت کے بعد بھی وہ وہیں کھڑا تھا۔

"مجھے ساتھ کیوں نہیں لے کر گئے آج؟ میں صبح آئی تو آپ جا چکے تھے۔" وہ کچن کے دروازے پہ جانے کہاں سے نمودار ہوئی۔ فارس نے کرنٹ کھا کر سر اٹھایا۔ پہلے تعجب اور پھر ناگواری اس کی آنکھوں میں بھرنے لگی۔

"آپ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

"میں دوپہر سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"کیوں؟" اس کا موڈ پہلے خراب تھا، اوپر سے وہ بولا۔

آبی ایک دم بالکل چپ ہو گئی۔ پھر اٹھی، پرس اٹھایا، چابیاں سنبھالیں۔ "کھانا لائی تھی، کچن میں پڑا ہے۔ کھا لیجئے گا۔ اب جب تک آپ کو ورک وائف کی ضرورت نہیں ہو گی، نہیں آؤں گی۔" خفا سی کہتی دروازے تک گئی۔ لمحے بھر کو رکی۔ شاید وہ معذرت کر لے مگر اس نے اسی رکھائی سے آواز لگائی۔ "دروازہ لاک کر کے جانا۔ میں لاک کرنے کے لئے اٹھ کر نہیں آنے لگا۔"

آبی نے آہستہ سے دروازہ بند کیا، لاک کیا اور چلی گئی۔ زمر ہوتی تو زور سے دے مارتی۔ اس ساری تھکن اور ذہنی دباؤ میں ایک دم اس کی یاد کسی تازہ ہوا کے جھونکے جیسی لگی تھی۔ وہ خود بخود ہلکا سا مسکرایا اور موبائل اٹھایا۔ پیچھے کو ٹیک لگائی اور پیر لمبے کر کے میز پہ رکھ لئے۔ کال ملا

کر فون کان سے لگایا۔

پاکستان میں.... زمر اپنے بیڈ روم میں بیٹھی تھی اور فائلز سامنے پھیلائے' لیپ ٹاپ پہ کھٹا کھٹ ٹائپ کیے جا رہی تھی' یکدم مزوں زوں ہونے لگی۔ ساتھ میں موبائل کی غیر شناسا گھنٹی بھی۔ قدرے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اسٹڈی ٹیبل سے اٹھی اور بیڈ تک آئی۔ سائیڈ ٹیبل کا پہلا دراز کھولا۔ اندر ایک چھوٹا بھدا سا موبائل پڑا بج رہا تھا۔ اچنبھے سے اس نے اٹھا کر دیکھا۔ "بلاکڈ نمبر کالنگ۔"

"ہیلو؟" محتاط ہیلو کیا۔

"وعلیکم ہیلو۔" وہ مسکرا کر بولا تھا۔ یہ آواز... یہ لہجہ... وہ اسی طرح کھڑی رہی۔

"کیسی ہیں آپ؟" زمر کے دل میں ایک دم بہت سے جذبات امڈ آئے جن میں غصہ سر فہرست تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ رکھائی سے بولتے ہوئے بیڈ پہ بیٹھی۔ "کیسے فون کیا؟"

"سوری' پہلے نہیں کر سکا۔ مصروف رہا۔" وہ شائستگی سے معذرت کر رہا تھا۔ اس نے محض "اچھا" کہا۔ اور کیا کہتی۔ آنکھوں سے پٹی ہٹی تو جان گئی تھی کہ اس کی کیا مصروفیت تھی۔ مگر کیسے حالات تھے ایک سوال بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"یہ فون کس کا ہے؟"

"میرا ہی ہے۔ انکریپٹڈ ہے۔ سیف لائن ہے۔ اس لئے اسے چھوڑ گیا تھا۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔ فارس ذرا سیدھا ہو کر بیٹھا۔ آنکھوں میں سوچ ابھری۔

"تم ٹھیک ہو۔"

"مجھے کیا ہونا ہے۔"

"ناراض ہو؟"

"نہیں۔" اس کے ابرو اسی طرح تنے تھے۔

"پھر ایسے کیوں بات کر رہی ہو؟ میں پہلے بہت پریشان ہوں' تم مجھے مزید پریشان کر رہی ہو۔" وہ سنجیدگی سے بولا تو زمر کی ساری رکھائی ہوا ہوئی۔ مفاد مشترکہ پھر سے درمیان میں آ گیا۔

"تم کیوں پریشان ہو؟ کام... کام ٹھیک سے نہیں ہو رہا؟" بے چینی سے بولی۔

وہ خاموش ہو گیا۔ ورک وائف سے زیادہ اصلی وائف سے بات کرنا مشکل تھا مگر زیادہ سکون بھی اسی میں تھا۔ اس نے سر مزید پیچھے گرا کر آنکھیں موند لیں۔ دل ایک دم بہت بھاری ہو گیا تھا۔

"فارس... بولو نا..." وہ واقعی پریشان ہو گئی تھی۔ ہر دفعہ سعدی کے قریب پہنچتے پہنچتے وہ دور کیوں چلے جاتے تھے؟

"تم میرے لئے دعا کیا کرو۔" وہ آنکھیں بند کیے' پیشانی مسلتا کہہ رہا تھا۔

''کیا دعا کروں؟'' وہ بیڈ کے قریب نیچے فرش پہ بیٹھتی گئی۔ آنکھوں میں اداسی در آئی تھی۔

''یہی کہ میں athiest نہ بن جاؤں۔'' زمر کے دل کو دھکا سا لگا۔

''تم athiest کبھی نہیں بن سکتے۔ تم مسلمان ہو اور رہو گے۔''

''اب نہیں ہوں۔ زمر مجھے اب کسی چیز کا یقین نہیں رہا۔'' اس نے آنکھیں کھول کر چھت کو دیکھا تو ان سنہری آنکھوں میں بے پناہ مایوسی تھی۔

''مجھے نہیں لگتا کہ ایسا کچھ ہے۔ تم اندر سے مسلمان ہی ہو۔ تم صرف اپنے دین سے ناراض ہو۔'' وہ خاموش رہا۔ ساری ناراضی بھلا کر وہ نرمی سے فکرمندی سے کہہ رہی تھی۔

''تم یہ سوچتے ہو کہ تمہارے دشمن سب کچھ کر کرا کے بھی وائٹ کالر اور شریف نظر آتے ہیں اور ہم جو اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں' ہم کرمنلو لگنے لگے ہیں۔''

''میں کرمنل بن چکا ہوں۔ تم بھی۔ شاید سعدی بھی۔''

''فارس۔'' اس نے دھیرے سے پکارا۔ ''شریعت سخت ہو سکتی ہے' مگر وہ قانون کی طرح اندھی نہیں ہوتی۔ اپنے دین سے اتنا ناراض نہ ہو۔ تم کل بھی بے گناہ تھے' اور کل بھی رہو گے۔''

''تم میرے لئے دعا کیا کرو۔'' وہ پھر سے بولا تھا۔

''میں کروں گی۔ مگر پہلے تمہیں واپس انسان بننا پڑے گا۔ فارس تم خدا نہیں ہو۔ تم سارے کام ایک ساتھ نہیں کر سکتے۔ تم جو بھی کام ابھی کر رہے ہو' اگر تم نہ بھی کر سکے تو بھی ہم میں سے کوئی تمہیں الزام نہیں دے گا۔ تم انسان ہو۔ اپنی وسعت کے مطابق جتنا کر سکتے تھے کر لیا۔ وہ خدا ہوتا ہے جو سب ٹھیک کر سکتا ہے۔ انسان نہیں۔''

''اگر میں یہ نہ کر سکا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔''

''تو پھر اپنے اندر کے مسلمان سے جنگ کرنا چھوڑ دو۔ میں یہ نہیں کہتی کہ نمازیں پڑھو' تہجد پڑھو' قرآن پڑھو۔ کچھ بھی نہ کرو۔ صرف خود کو اس مسلمان کے حوالے کر دو۔''

''کیا اس طرح مجھے سکون مل جائے گا؟''

''فارس ہم سکون کے لئے مسلمان نہیں بنتے۔ خود کو اپنی تسکین کے لئے نہیں جھکاتے۔ خود کو اللہ کے سپرد اپنی خوشی کے لئے نہیں کرتے۔ ہم اس لئے کرتے ہیں یہ کیونکہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی آپشن نہیں ہے۔ اس دنیا میں ... اور اس دنیا سے باہر کی دنیا میں اس خود سپردگی کے سوا کوئی راستہ ہے ہی نہیں' ہماری بقا کا۔''

''اچھا۔'' وہ ہلکا سا مسکرایا۔ ''کوشش کروں گا۔''

''گڈ'' وہ بھی مسکرائی۔ فارس نے الوداعی کلمات کہہ کر فون رکھ دیا تو زمر کو بھول چکا تھا کہ وہ اس سے ناراض تھی۔ وہ مسکرا کر واپس فائلز کھولنے لگی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

خوابوں کی ہوا راس تھی جب تک مجھے محسن

یوں جاگتے رہنا میری عادت نہ ہوئی تھی

زمر کے کمرے سے چند گز دور... حنین ڈائننگ ہال میں اپنی مخصوص کرسی پہ پیر اوپر کیے بیٹھی تھی۔ لیپ ٹاپ پہ اس کا پروگرام چل رہا تھا (ناکامی ورنا کامی) اور ساتھ وہ شیخ کی کتاب کھولے ہوئے تھی۔

روز فجر پڑھ لینے اور باقی نمازیں وقت پہ ادا کر لینے کے باعث مرض سے بننے والے زخم کسی حد تک مندمل ہوتے گئے تھے مگر کبھی کبھی جو خالی پن در آتا' وہ گھر کے ڈھیروں کاموں اور کمپیوٹر کے بکھیڑوں کے باوجود ختم نہ ہوتا۔ ایسے میں امام ابن قیم الجوزیہ کی کتاب 'ایک تسلی بخش جواب اس کے لئے جس نے سوال کیا تھا دوائے شافی کے بارے میں'' کھول لینا راحت اور سکون کا سبب بنتا تھا۔ اس کتاب کے کئی نام تھے۔ مرض اور دوا' الجواب کافی' دوائے شافی' مگر اسے اس کا اصل اور مکمل نام ہی سب سے زیادہ پسند تھا۔ پس منظر میں آتی امی کی پکار کو نظر انداز کر کے اس نے وہ قدیم' بھاری سا دروازہ دھکیلا تو آگے زرد سنہری دھوپ میں لپٹا منظر سا کھلتا گیا۔

وہ سونے کے ذرات جیسا تا حدِ نگاہ چمکتا ہوا صحرا تھا۔ دور قطار میں اونٹ سامان اٹھائے' خراماں خراماں چلتے دکھائی دے رہے تھے۔ حنین نے دھوپ سے بچنے کے لئے ماتھے پہ ہاتھ سے سایہ کیا اور پھر ادھر ادھر گردن گھمائی۔ دوسری طرف... کافی دور... کھجور کے دو درخت تھے۔ ایک بے حد اونچا اور گھنا' اور ایک اس سے کافی چھوٹا۔ بڑے شجر تلے بیٹھے بوڑھے استاد کو دیکھ کر وہ مسکرائی اور اسی طرف کو چلنے لگی۔ پیروں میں گرم ریت جلنے لگی مگر سائبان میں بیٹھ کر تو نخلستان نہیں اگائے جاتے۔ علم کے لئے محنت تو کرنی ہوتی ہے۔

ان کے سامنے جا کر وہ ادب سے دو زانو ہو کر بیٹھی۔ وہ زمین پہ کپڑا بچھا کر بیٹھے' سر جھکائے' ہاتھ میں پکڑی تختی پہ قلم سیاہی میں ڈبو ڈبو کر لکھ رہے تھے۔

''لوگ محبت کی راہ میں کیوں بھٹکتے ہیں' اے شیخ؟''

انہوں نے بنا سر اٹھائے' اسی طرح لکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''صرف وہی بھٹکتے ہیں جو محبت کی قسموں کے درمیان فرق اور تمیز نہیں کر سکتے۔''

''محبت کے وہ سات درجے جو آپ نے بتائے تھے؟''

''نہیں۔ ہم محبت کی پانچ اقسام کی بابت گفتگو کر رہے ہیں۔ سنو گی؟''

''بالکل چپ ہو کر سنوں گی' کیونکہ میں نے یہ سیکھا ہے کہ دین پڑھانے والوں کا ادب کرنا چاہیے اور ان کے بارے میں احتیاط سے بات کرنی چاہیے۔ کیا پتہ اللہ کے نزدیک ان کا دل سونے کا اور ہمارا چارکول کا ہو۔'' وہ دونوں ہتھیلیوں میں چہرہ گرائے بیٹھی توجہ سے سننے لگی۔

شیخ نے آخری فقرہ لکھا پھر تختی پرے رکھی اور سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ہلکا سا مسکرائے۔ "محبت کی پانچ قسمیں ہیں۔ پہلی ہے.. اللہ سے محبت کرنا۔ مگر یاد رکھنا صرف اللہ سے محبت کرنا انسان کو دونوں جہانوں میں کامیاب نہیں کرا سکتا' کیونکہ اللہ سے تو کافر مشرک یہود صلیب پرست' سب محبت کرتے ہیں۔"

حنین ذرا الجھ گئی' مگر خاموش ہو کر سننے لگی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"دوم۔ جو کچھ اللہ کو پسند ہے اس سے محبت کرنا۔ یہی محبت انسان کو اسلام میں داخل کرتی ہے' اور انسان کو اللہ کا دوست بناتی ہے۔

سوم۔ وہ محبت جو صرف اللہ کے لئے ہو' اور اللہ کی راہ میں ہو۔ یعنی جس سے اللہ محبت کرتا ہے' اس سے محبت رکھنا۔ دوسری محبت وہ تھی جو اللہ کے پسند کے کاموں سے کی جائے۔ یہ تیسری وہ ہے جو اللہ کو خوش کرنے کے لئے اسکی مخلوق سے بالعموم اور اس کے محبوب لوگوں سے بالخصوص رکھی جائے۔ یہ صرف تب صحیح ہے جب مقصد اللہ کی رضا ہو۔

چہارم۔ ایسی محبت جو اللہ کے ساتھ انسان کسی دوسرے سے بھی کرے اور یہ اللہ کے دین کے لئے نہ ہو' اسکی رضا کے لئے نہ ہو' اسکی مرضی کے مطابق نہ ہو تو یہ مشرکانہ محبت ہے۔ یعنی وہ اللہ کے برابر کسی دوسرے انسان کو لا کھڑا کر رہا ہے۔ مشرک لوگ ایسی ہی محبت کرتے ہیں اللہ سے۔"

حنہ نے سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ "اور بھلے یہ محبت کتنی ہی پاک صاف ہو' یہ انسان کو شرک کی طرف لے جاتی ہے۔"

"بالکل۔ اب رہی پانچویں محبت۔ تو اس سے ہمیں بحث نہیں۔" شیخ نے ملائمت سے کہتے ہوئے اپنی تختی دوبارہ اٹھالی اور اس پہ لکھتے ہوئے بولے۔

"اور یہ ہے طبعی محبت۔ انسان اپنی فطرت سے مجبور ہو کر جب محبت کرتا ہے۔ جیسے پیاسا پانی سے... بھوکا روٹی سے... انسان اپنی بیوی بچوں سے.. اپنے ماں باپ گھر والوں سے... دوستوں سے محبت کرتا ہے... کوئی اپنے کام سے محبت کرتا ہے... اگر یہ محبت آپ کو اپنے اندر الجھا کر اللہ سے غافل نہیں کر رہی تو اس میں کوئی برائی نہیں۔ یہ اچھی اور مثبت محبت ہے جو انسان کو انسان بناتی ہے۔"

"حنین... حنین..." اور اسکے سارے ارتکاز کو امی کی آواز نے توڑ کر رکھ دیا۔ اس نے پوری کوشش کی کہ وہ اسی صحرا کے... نخلستان میں بیٹھی رہے مگر سلگتی ریت کی تپش ختم ہونے لگی.... سائبان کی ٹھنڈ عنقا ہوئی.... شیخ کی آواز مدھم ہوئی اور....

اس نے جھلا کر ڈائننگ ٹیبل سے سر اٹھایا۔ "کیا ہے امی؟" اور تن فن کرتی باہر لاؤنج میں آئی۔

رات کے کھانے کے بعد کا معمول کا منظر سامنے تھا۔ ٹی وی چل رہا تھا۔ سیم اور ابا نیوز دیکھ رہے تھے۔ ملازم کام ختم کر کے جا چکے تھے۔ اور ندرت صوفے پہ بیٹھیں' عینک لگا کر موبائل دیکھتیں' کہہ رہی تھیں۔

"پہلے تو یہ آدھا کملا تھا ہی مگر جب سے اس کی بیٹی ہوئی ہے' مزید سٹھیا گیا ہے۔"

"کون امی!" حنہ نے بڑے ہی ضبط سے پوچھا۔ کون سی منحوس گھڑی تھی جب بھائی امی کو android پہ لایا تھا۔

"یہی فیس بک والا مارک ذکر برگ۔ عجیب عجیب میلو بھیجتا ہے مجھے کہ میرا اکاؤنٹ لاگ اِن ہو رہا ہے کہیں اور... تا پہلے اس نے فیس بک کے شیئرز آگے دے دیے... پھر..." حنین کے تو پتنگے لگ گئے۔

"امی فیس بک ای میلز وہ خود بیٹھ کر آپ کو نہیں بھیجتا' وہ آٹومیٹک ہوتی ہیں۔ ہزار دفعہ منع کیا ہے آپ کو کہ ہر دوسری آنٹی کے گھر جا کر وائی فائی سے فون نہ جوڑ لیا کریں' مگر آج کل کی مائیں سنتی کہاں ہیں۔" وہ مڑ گئی۔

ندرت نے عینک کے پیچھے سے غصے سے اسے گھورا۔ "تاں کس کے گھر جاتی ہوں میں؟ سارا دن ریسٹورانٹ میں خوار ہو کر گھر آتی ہوں۔ پہلے تمہاری بک بک سنو' پھر اس ڈھیٹ فیس بک کی' دو دن سے پاگل کر رہا ہے مجھے میلو کر کر کے' آیا وڈا کہ تمہارا اکاؤنٹ سری لنکا میں کھولا جا رہا ہے۔ نہ اس سے پوچھو وہاں میرے ابا کے..."

امی کو مارک ذکر برگ کی اپنی بیٹی کی پیدائش سے قبل کی ہر اپ ڈیٹ پہ سخت تاؤ چڑھتے تھے۔ (خود بھی بے غیرت' اس کا فیس بک بھی بے غیرت) اور وہ اس کی شان میں گھنٹوں گستاخی کر سکتی تھیں مگر حنین ذوالفقار یوسف خان کی ساری دنیا اس ایک لفظ پہ تھم سی گئی تھی۔

سری لنکا؟

سری لنکا! وہ بے یقینی سے پلٹی اور دوسرے ہی پل گویا چھلانگ لگا کر امی کی طرف لپکی۔ اور فون ان کے ہاتھ سے جھپٹا۔ راستے میں پانی کے جگ سے ٹکرائی جو لڑھک کر گرا اور سیم کو بھگو گیا۔ وہ الگ چیخنا شروع ہوا اور ندرت کا ہاتھ بے اختیار جوتے تک گیا مگر حنہ دیوانہ وار کھڑی ہوئی' ان کا فون پکڑے پاگلوں کی طرح بٹن دبا رہی تھی۔ ابا بھی حیران پریشان اسے دیکھنے لگے۔ پھر وہ گرجے۔ "کیا بدتمیزی ہے حنین؟" ایک دم سے اتنا شور و غل مچ گیا کہ زمر کمرے سے نکل آئی۔ "کیا ہوا؟"

"امی... امی..." وہ ایک ای میل نیچے کرتی جا رہی تھی۔ آنکھیں گلابی سی نم پھیل رہی تھیں۔ "بڑے ابا... زمر... یہ سعدی ہے... یہ میرا بھائی ہے.. امی کا اکاؤنٹ بھائی کھول رہا ہے... یہ میرا بھائی ہے امی!"

کیا تم نے کبھی سانس رکنے کی آواز سنی ہے؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اب سانس کا احساس بھی اک بارِ گراں ہے
خود اپنے خلاف ایسی بغاوت نہ ہوئی تھی

کینڈی کے پہاڑوں پہ اترتی شام اپنے ساتھ ٹھنڈک کی نئی لہر لائی تھی۔ مگر کافی شاپ کے اندر ہیٹر کی گرمائش اور گرما گرم کافی کی مہک نے ماحول کو خوشگوار بنا رکھا تھا۔ سعدی کچن کے کونے میں اسٹول پہ بیٹھا تھا۔ کامنی آتے جاتے اسے دیکھتی تو مسکرا دیتی' وہ بھی مسکرا دیتا۔ بوڑھا سنہالی جھنڈرار وپا سنگھی سعدی کو دیکھے بنا کام نپٹا رہا تھا۔ دفعتاً ایپرن پہنے کھڑی کامنی نے ایک ویٹر کو کچھ کہا تو سعدی کھڑا ہوا۔

"اس کے اوپر پہلے ہی بہت کام ہے۔ میں کر دیتا ہوں۔"

کامنی نے فوراً سے نفی میں سر ہلا کر اس کو روکنا چاہا۔ ”نہیں، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم آرام کرو۔“ مگر سعدی صرف مسکرا کر ویٹر کی طرف مڑا۔

”کس میز سے آرڈر لینا ہے؟ مجھے دکھا دو۔“ ویٹر کو اور کیا چاہیے تھا، وہ اسے فوراً باہر لے آیا۔ بوڑھے سنہالی کی گہری نظروں نے دور تک دونوں کا پیچھا کیا تھا۔ ویٹر نے میز اسے دکھائی تو وہ سر ہلا کر آگے بڑھ گیا۔ کامنی بھی پیچھے چلی آئی۔

”وہ مینیو تو لے کر ہی نہیں گیا۔“ اس نے اچنبھے سے پہلے ویٹر کو دیکھا، پھر سعدی کو جو اعتماد سے مسکراتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ پھر مینیو کارڈ اٹھایا اور پیچھے گئی۔

سعدی نے میز کے دہانے رک کر وہاں بیٹھے تینوں افراد کو دیکھا۔ ایک درمیانی عمر کے انکل اور دو گول مٹول سے بچے۔

”کیا آپ انگریزی بول سکتے ہیں، سر؟“ اس نے شائستگی سے مخاطب کیا۔ کامنی گہری سانس لے کر رہ گئی۔ جانتی تھی لڑکے کو جاب چاہیے اور اب وہ اسے متاثر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ (مگر کارڈ تو میرے ہاتھ میں ہے۔) وہ بھی ہاتھ سینے پہ لپیٹ کر مزے سے تماشا دیکھنے کھڑی ہو گئی۔

سنہالی انکل نے مسکرا کر بتایا کہ وہ انگریزی بول سکتا ہے۔ (سری لنکا ایک انتہائی پڑھا لکھا ملک ہے۔ جہاں اس کی ایک کثیر تعداد انگریزی میں مہارت رکھتی ہے۔)

”آپ آئسکریم لیں گے، یقیناً؟“ اس نے پوچھا۔ انکل نے سر ہلایا اور مینیو کارڈ مانگا۔

”مجھے آپ سے مینیو پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے، سر مجھے معلوم ہے کہ آپ کیا لیں گے۔“

مسکرا کر کہتا وہ مڑا، کامنی پہ ایک فاتحانہ نظر ڈالی اور کچن کی طرف آ گیا۔ مہمان انکل اور بچوں نے اچنبھے سے اسے دیکھا اور کامنی گڑبڑا کر پیچھے گئی۔

”یہ کیا کیا تم نے؟“ وہ قدرے حیران، قدرے خفا تھی۔ وہ چپ چاپ پیالوں میں مختلف فلیورز کے سکوپ بھرنے لگا۔ پھر ہر پیالے کو الگ الگ پلیٹ میں رکھ کر اوپر سے ڈھکا اور میز پہ لے گیا۔

”میں نے ابھی آرڈر کرنا تھا، جناب۔“ ان صاحب نے فوراً ٹوکا۔ اس نے مسکرا کر ایک ڈھکا ہوا پیالہ نکال کر ان کے سامنے رکھا۔

”آپ کون سا فلیور پسند کریں گے، سر؟“

ان صاحب نے پہلے مینیو کو دیکھا، پھر قدرے غیر آرام دہ انداز میں اسے دیکھا۔

”ونیلا مگر میں....“

سعدی نے ان کے پیالے کا کور اٹھایا۔ اندر ونیلا آئسکریم رکھی تھی۔ انہوں نے چونک کر اسے دیکھا جو اب بچوں کی طرف متوجہ تھا۔ ایک ایک پیالہ دونوں کے سامنے رکھ کر پوچھا۔ ”آپ کیا لیں گے؟“

متجسس اور پر اشتیاق بچوں نے اپنے من پسند فلیور بتائے اور پھر اپنے پیالوں کے کور ہٹائے۔ دونوں کے وہی تھے جو وہ چاہتے تھے اور وہ دونوں مختلف تھے۔

''واؤ!'' انہوں نے حیرت اور ستائش سے اسے دیکھا۔ پیچھے کھڑی کامنی کا منہ کھل گیا۔ کاؤنٹر پہ کھڑے ویٹر ہکا بکا سے ٹکر ٹکر اسے دیکھ رہے تھے۔

''ہم یہاں پہلی دفعہ آئے ہیں، تمہیں کیسے پتہ کہ....؟'' وہ صاحب حیرت سے بولے تھے۔

''پہلی دفعہ آئے ہیں تو اب آتے رہیے گا اور...'' بچوں کو دیکھ کر کہا۔ ''یہ میجک آئس کریم ہے اور میں جادوگر ہوں۔ جب آپ اگلی دفعہ اپنے دوستوں کے ساتھ آئیں گے تو میں ان کے فلیور بھی بوجھ لوں گا۔'' اور سر کو خم دے کر مڑا، کامنی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے آنکھ دبائی اور آگے بڑھ گیا۔

''تم نے یہ کیسے کیا؟ ہاں؟'' کامنی حیران اور قدرے پریشان سی پیچھے آئی تھی۔

''میں تو ویٹر کا کام ہلکا کر رہا تھا۔ یو نو، اب میں بہتر محسوس کر رہا ہوں، مجھے چلنا چاہیے۔'' پینٹری میں آ کر اس نے اپنا بیگ اٹھایا۔ (اس بات سے ناواقف کے بوڑھا سنہالی اتنی دیر میں اس کے بیگ سے وہ پوسٹر نکال چکا ہے۔)

''ایک منٹ۔ تم بتاؤ۔ تمہیں کیسے پتہ تھے ان کے فلیورز؟''

''مجھے نہیں پتہ تھے۔ یہ صرف ایک ٹرک تھی۔''

''کیسی ٹرک؟'' سعدی گہری سانس لے کر اس کی طرف گھوما۔

''امریکہ کے ایک ریسٹورانٹ میں ایسے کرتے ہیں وہ۔ مجھے کسی نے ان کی ٹرک کا راز بتا دیا تھا۔'' کامنی کی آنکھیں چمکیں۔

''تو مجھے بھی بتاؤ نا۔''

''سوری۔ میں اس ٹرک کو خود استعمال کر کے اپنی کافی شاپ بناؤں گا۔'' وہ فاتحانہ نظروں سے اسے دیکھتا مسکرایا۔ کامنی کچھ دیر سوچتی رہی۔

''میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں جتنی لگتی ہوں۔''

''اچھا!'' وہ پھر مسکرایا۔

''بیگ رکھ دو۔ اوپر ایک کمرہ ہے اسے صاف کر لو اور وہیں رہو۔ آج سے تم یہاں کام کرو گے۔ اور تمہاری اس ٹرک سے ہم دونوں پیسے کمائیں گے۔'' وہ جانتی تھی لڑکا نوکری چاہتا ہے اور اب اس کے پاس اس کو اپنی دکان سے دور کرنے کی کوئی وجہ نہیں رہی تھی۔ کافی شاپ میں ان صاحب اور ان کے بچوں کے چہرے کی خوشی... اور ایسے کتنے کسٹمر اب بار بار پلٹ کر ادھر آئیں گے۔ کامنی جب مڑی تو ذہن میں جمع تفریق کر رہی تھی اور وہ لڑکے کے لئے خوش بھی تھی۔

سعدی نے گہری سانس لے کر آنکھیں بند کیں اور وہیں کاؤچ پہ بیٹھ گیا۔ اس کو ایک قدرے مضبوط چھت مل گئی تھی۔

اور کافی شاپ سے باہر... سڑک کنارے مہندرا ہاتھ میں ایک کاغذ پکڑے اس پہ لکھے نمبرز دیکھ رہا تھا۔ پوسٹر کے ادھورے نمبر میں ایک ہندسہ تو موبائل کوڈ کا حصہ تھا جو اسے معلوم تھا کہ ایک ہی ہوتا ہے۔ دوسرے ہندسے کی جگہ اس نے صفر سے نو تک سب نمبر ملا کر لکھ لئے اور اب باری باری سب پہ کال کر رہا تھا۔

''آپ کا نمبر میں نے پوسٹر پہ پڑھا... اچھا سوری رانگ نمبر۔'' وہ بار بار معذرت کر کے فون بند کر دیتا۔ اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

''کیا آپ نے وہ اشتہار دیا ہے؟ اچھا معذرت۔''

''کوئی آٹھواں نمبر تھا جب دوسری جانب سے فصیح نے کال اٹھائی۔

''کیا آپ نے وہ پوسٹر والا اشتہار دیا تھا؟'' وہ اب جھکنے لگا تھا۔

''ہاں' میں نے دیا تھا۔ تم نے دیکھا ہے کہیں اس کو؟'' وہ چونک کر بولا۔ مہندرا کا چہرہ چمک اٹھا۔

''اگر میں کہوں ہاں' تو؟ کیا مجھے انعام کی وہ رقم ملے گی؟''

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اجڑے ہوئے اس دل کے ہر اک زخم سے پوچھو

اس شہر میں کس کس سے محبت نہ ہوئی تھی

''میں بتاتی ہوں۔'' زمر انگلیاں مروڑتی صوفے پہ ان کے سامنے بیٹھی۔ حنین تو ہر چیز سے بے نیاز لیپ ٹاپ آن کر کے دیوانہ وار امی کی میلز کھول کھول کر دیکھ رہی تھی اور سیم اس کے ساتھ آ بیٹھا تھا۔ ندرت نے گویا دل تھام لیا تھا اور ابا بہت امید سے زمر کو دیکھ رہے تھے۔ وہ سر جھکائے' انگلیاں مسلسل مروڑتی کہنے لگی۔

''ہاشم کاردار نے سعدی کو گولیاں مروائیں تھیں۔ اسی نے سعدی کو اغوا کروایا تھا۔ ہم سب یہ بات جانتے تھے' آپ سے چھپایا اس لئے کہ....'' نظریں اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا۔ ندرت صوفے پہ آگے کو ہو کر بیٹھیں' نم آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ابا البتہ تھکن سے زمر کو دیکھ کر بولے تھے۔

''اس لئے کہ تمہیں لگا ہم کسی کو بتا دیں گے؟'' زمر نے ندامت سے سر ہلایا۔

''جی۔ مگر ہم غلط تھے۔ ہمیں اپنے خاندان سے باتیں نہیں چھپانی چاہئیں۔''

''ہاشم!'' ابا نے چہرہ ایک ہاتھ میں گرا دیا۔ وہ افسوس' اور صدمے کا شکار تھے۔ ''میں اسے کبھی پسند نہیں کرتا تھا' مگر ہمیشہ لگتا تھا ایک دن وہ اچھا آدمی بن جائے گا۔ اس نے کیوں کیا ہمارے بچے کے ساتھ ایسا؟ ہم نے کیا بگاڑا تھا اس کا؟''

''وارث غازی کو اس نے قتل کروایا تھا' سعدی یہ بات جان گیا تھا تو اس نے....''

"زمر مجھے یہ بتاؤ سعدی کہاں ہے؟" ندرت بے قراری سے بولی تھیں۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ ان کو کسی کا کردار' کسی مجرم' کسی وجہ قتل کی پرواہ نہ تھی۔ بس ایک ہی سوال تھا۔ وہ ہے کہاں؟

"وہ سری لنکا میں ہے۔ مجھے نہیں پتہ کیسے مگر وہ ان کی قید سے نکل گیا ہے۔ اب وہ کہاں ہے' ہمیں نہیں معلوم۔ اس نے ہمیں فون تک نہیں کیا۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیں فون بھی نہ کرے؟" وہ الجھی تھی۔

"تم نے بھی تو چار سال اسے فون نہیں کیا تھا۔" ابا کے شکوے پہ اس کا دل کٹ گیا۔ وہ چار سال کب آئے' کہاں گئے؟ اسے یاد ہی نہ تھے۔ مگر ندرت کو پرواہ نہ تھی۔ وہ بے قراری سے پوچھ رہی تھیں۔

"وہ مل جائے گا نا؟" آنسو ان کی آنکھوں سے نکل نکل کر چہرے پہ لڑھک رہے تھے۔

"فارس اس کو ڈھونڈنے گیا ہے۔ وہ کولمبو میں ہے۔"

"ماموں کولمبو میں ہیں؟" حنین نے چونک کر اسے دیکھا۔ زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔ حنہ بالکل بے یقین رہ گئی۔

"تم سب اتنے جھوٹ کیوں بولتے ہو زمر؟ میں نے کس کو بتانا تھا؟ میں نے تو صرف دعا کرنی تھی۔" ندرت نے آنسو صاف کرتے ہوئے دکھی دل سے شکوہ کیا۔ بڑے ابا ہنوز ماتھے کو ہتھیلی پہ گرائے آنکھیں موندے بیٹھے تھے۔

"تو ماموں کولمبو..." اس کی آنکھیں چمکیں۔ لب مسکراہٹ میں ڈھلے مگر پھر وہ چونکی۔ "مگر بھائی اب کولمبو نہیں ہے۔ پہلے اس نے اکاؤنٹ کولمبو سے کھولا تھا اب کینڈی سے کھولا ہے۔"

"جی' پھپھو۔ یہاں کینڈی لکھا آ رہا ہے۔" سیم نے بے قراری سے حنہ کے کندھے کے پیچھے سے اسکرین کو دیکھ کر کہا۔ وہ بار بار سب کے چہرے دیکھتا تھا۔ رونا تھا یا خوش ہونا تھا' کون سا تاثر دینا تھا' وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

ندرت نے دوپٹہ سر پہ لیا' اور تسبیح اٹھا کر وہاں سے اٹھ گئیں۔ زمر نے ناسیت سے انہیں جاتے دیکھا۔ "سوری بھابھی۔ مجھے آپ کو سب سے پہلے بتانا چاہیے تھا۔ آپ کا سب سے زیادہ حق تھا۔"

"فارس... تم... سعدی... تم سب ایک جیسے ہو۔" وہ گلے سے کہتیں' نم آنکھیں انگلی کی نوک سے صاف کرتیں وہاں سے نکل گئیں۔ سیم اس کے پاس آیا اور اس کا بازو ہلایا۔ "پھپھو' ماموں کو کال کریں' ان کو بتائیں نا۔" زمر نے چونک کر اسے دیکھا۔

"اس کو پتہ ہو گا سیم۔"

"تو پھر وہ کولمبو میں کیوں ہیں؟" حنین نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "اور آپ نے مجھ سے بھی چھپایا۔"

"مجھ سے بھی اس نے چھپایا تھا۔" وہ دکھی دل سے کہتی اٹھی اور کمرے میں جا کر وہ موبائل نکالا۔ اس میں ایک ہی کانٹیکٹ فیڈ تھا۔ زمر نے کال ملائی۔

برف ایسی کہ پگھلتی نہیں پانی بن کر

پیاس ایسی کہ بجھاتے ہوئے تھک جاتا ہوں

زمر سے بات کرنے کے بعد فارس کتنی ہی دیر صوفے پہ لیٹا رہا۔ پھر وہ اٹھا اور لب ایک دوسرے میں پیوست کیے، کچھ سوچنے لگا جیسے کچھ ناپسندیدہ کرنے جا رہا ہو۔ چند منٹ جب وہ اپارٹمنٹ کا دروازہ باہر سے لاک کر رہا تھا تو اس کے چہرے پہ ایک عزم تھا اور ساری تھکن ہوا ہو چکی تھی۔

وہ مڑا تو ایک دم ٹھٹک کر رکا۔

باہر سیڑھیوں پہ وہ بیٹھی تھی۔ سرخ بلی۔ اداسی سے گھٹنوں پہ تھوڑی گرائے وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔ وہ گہری سانس لے کر سر جھٹکتا اس سے ایک زینہ اوپر بیٹھا۔

"یہاں کیا کر رہی ہیں آپ؟"

"آپ کو تنگ تو نہیں کر رہی۔ اب کیوں پوچھ رہے ہیں۔" وہ اسی طرح چہرہ گھٹنوں پہ رکھے انگلی سیڑھی کے ماربل پہ پھیرتے ہوئے بولی تھی۔

"آبدار، آپ بہت اچھی ہیں، آپ نے میری بہت مدد کی ہے، لیکن میں آپ کو اپنی وجہ سے مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔" تبھی اس کا موبائل تھرتھرانے لگا۔ فارس نے نکال کر دیکھا۔ نمبر دیکھ کر مسکراہٹ خودبخود لبوں پہ بکھری۔

"ایک منٹ۔ میری بیوی ہے۔" اس کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے فون اٹھایا۔ آبی کے ہاتھوں کی حرکت تھم گئی۔ دل بھی تھم گیا۔ آنکھوں میں چبھن سی ابھری۔ مگر چہرہ نہیں اٹھایا۔ اسی طرح بیٹھی رہی۔

"ہیلو؟" وہ خوشگوار انداز میں بولا۔

زمر لاؤنج سے اٹھ کر گیلری میں آ کھڑی ہوئی۔ حقیقت کے سورج کی آگ برساتی روشنی میں کھڑے ہو کر اسکا سامنا کرنا آسان نہیں تھا۔ سر جھکائے انگلی سے ناخن رگڑتے اس نے کہنا شروع کیا۔

"وہ کولمبو میں نہیں ہے۔ کینڈی میں ہے۔" آواز بدقت لبوں سے نکلی تھی۔

فارس ایک دم بالکل پتھرا گیا۔ اس کا سانس بھی رک گیا۔ بے اختیار وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چہرے کی رنگت پھیکی پڑی۔ پھر ندامت سے پیشانی مسلتے اس نے نگاہیں جھکائے کہنا چاہا۔ "زمر.... آئی ایم سوری میں نے تم سے جھوٹ...."

"مجھے بھوک لگ رہی ہے میں اپارٹمنٹ کے اندر جا رہی ہوں، آپ بات کر کے آ جانا۔" آبدار زینے سے اٹھتے ہوئے کافی اونچی آواز میں بولی تھی۔ فارس بالکل سن رہ گیا۔ بے یقینی سے، سکتے سے اس نے آبی کو دیکھا جو کہ کر زینے چڑھنے لگی تھی۔ ارد گرد سے بے نیاز جیسے اپنے خیال میں کھوئی ہو۔

زمر نے ایک ایک لفظ سنا تھا۔ اس نے بے اختیار سہارے کے لئے دیوار پہ ہاتھ رکھا۔ چہرے کی رنگت سفید پڑتی گئی اور آنکھیں سرخ۔

''تم کدھر ہو فارس؟ اتنی رات کو تم کس کے ساتھ ہو؟'' اس کی آواز کپکپائی تھی۔

''کچھ نہیں...یہ...سنو! ایسا کچھ نہیں ہے۔'' غصے سے گردن موڑ کر اوپر مطمئن اور مگن سی جاتی آبی کو دیکھ کر وہ بدقت کہہ پایا۔ سارے الفاظ ختم ہو گئے تھے۔ اس کا ایک فقرہ کئی تقریروں پہ بھاری ہوتا تھا' آج سارے لفظ ہلکے ہو گئے تھے۔

''تم اس کے ساتھ ہو...اس کے اپارٹمنٹ میں؟ تم...'' صدمے اور غصے سے اس کی آواز کانپی۔ ''تم...'' ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا۔

''میری بات سنو۔ میں تمہیں سب بتاتا ہوں۔ شروع سے۔ پلیز میری بات سنو۔'' وہ پسینے سے تر ہوتے چہرے کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

مگر سچ بولنے کا وقت اب گزر چکا تھا۔ اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ زمر نے کال کاٹ دی تھی۔ وہ پریشانی سے بار بار اسے کال ملا رہا تھا مگر وہ نہیں اٹھا رہی تھی۔

اوپر آسمان پہ چمکتا چاند چار روز پہلے ماہ کامل تھا۔

اب وہ کامل نہیں رہا تھا۔

چار دن کی چاندنی اس کے اندر سے گھٹ چکی تھی اور آگے اندھیری رات تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

" کافر ، ماکر، کاذب، قاتل " کا باب طوالت کی وجہ سے

دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ، اسکا دوسرا حصہ آپ اگلے ماہ

مئی کے خواتین ڈائجسٹ میں نمل کی بائیسویں قسط میں

پڑھ سکیں گے. انشاءاللہ



Nemrah Ahmed: Official

#TeamNA